66

برنارڈ گریبا نیئر
کمال احمد رضوی

میری لائبریری

عظیم ڈرامہ نگار

# تھارنٹن وائلڈر

فن اور زندگی کا
ایک جامع ناقدانہ جائزہ

پہلی مرتبہ میری لائبریری ہی میں

میری لائبریری میں

# تھارنٹن وائلڈر

میری لائبریری
(۱۴۲)

امریکی ادب کو دنیا کا ایک ''نوخیز ادب'' کہا جاتا ہے اور کئی اعتبارات سے انگریزی ادب کی ایک شاخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی ادب نے اس تیزی سے ارتقائی مراحل طے کئے کہ اب اس کی منفرد اور آزاد حیثیت مسلم ہے۔ اب امریکی ادب اور ادیب کے بارے میں یورپی اور ایشیائی ممالک کے قارئین کی دلچسپیاں بڑھتی جا رہی ہیں ——!

''یونیورسٹی آف مینے سوٹا'' نے امریکی ادیبوں کے فن اور زندگی کے تنقیدی تعارف کے لئے کتابچوں کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ امریکہ کے عظیم ڈرامہ نگار تھارنٹن وائلڈر کے فن اور زندگی پر یہ کتابچہ بھی اسی اہم علمی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

وائلڈر کا شمار امریکہ کے صف اول کے ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ''ہماری بستی'' جیسے ڈرامے کا خالق ہے جو جدید ڈرامے کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وائلڈر کو اس کھیل کے علاوہ اور بھی کئی تخلیقات پر پلیٹزر پرائز جیسے اہم قومی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ وائلڈر نے موضوع اور تکنیک دونوں کے اعتبار سے جدید ڈرامے کو بنایا سنوارا ہے۔ ''ہماری بستی'' کا اردو ترجمہ بھی حال ہی میں شائع ہو چکا ہے جو انتظار حسین کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ وائلڈر کا دوسرا کھیل جس سے پاکستانی قارئین بخوبی آشنا ہیں۔ مشاطہ (The Matchmaker) ہے۔ یہ کھیل امریکہ میں فلمایا بھی جا چکا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ عشرت رحمانی نے کیا ہے۔

مصنف برنارڈ گریبانیئر، بروکلین کالج میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ وہ کم و بیش پندرہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ڈرامے پر تنقیدی کتب کے علاوہ ان کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مترجم کمال احمد رضوی اردو کے بیحد ذہین اور قابل رشک حد تک کامیاب و مقبول ڈرامہ نویس، اداکار اور ہدایت کار ہیں۔ وہ اسٹیج اور ٹی وی دونوں میدانوں میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ جدید اردو اسٹیج کی ترویج و ترقی میں تنہا ان کا حصہ جدید اردو ڈرامے کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ ٹی وی کیلئے انکا ہفتہ وار پروگرام ''الف نون'' عوام و خواص سے یکساں طور پر داد حاصل کر رہا ہے۔

# میری لائبریری میں ادب و تنقید کی دوسری کتابیں

اردو کا بہترین انشائی ادب، ڈاکٹر وحید قریشی
جواہر ریزے، مولانا ظفر علی
غبارِ خاطر، ابوالکلام آزاد
تذکرہ ″
ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی
تنقیدی مضامین (اصناف شعر)۔ عابد علی عابد
تنقید شعر، انیس ناگی
متاعِ ادب، اظہر زیدی
پنجابی ادب کی مختصر تاریخ، احمد حسین قریشی
ولی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) مرتب محمد خان اشرف
روشِ نگارش (فارسی) کاظم رجوی
ارنسٹ ہمینگوے (تنقیدی مطالعہ) فلپ ینگ
ولیم فاکنر ″ ولیم وان اکونر
مارک ٹوین ″ لیوئیس لیری
والٹ وٹمین ″ رچرڈ چیز
رالف والڈو ایمرسن ″ جوزیفائن مائلز
والڈن ٹام سائر کے کارنامے، مارک ٹوین

میدانِ عمل از پریم چند، معہ مقدمہ
میرے بھی صنم خانے، قرۃ العین حیدر
ناول نگاری (تاریخ و تنقید) ڈاکٹر سہیل بخاری
ادب اور تعصب، اکبر امامی
باغ و بہار (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) سلیم اختر
سرشار ″ ڈاکٹر احراز نقوی
آغا حشر اور ان کا فن، اے بی اشرف
دیوانِ ولی، مرتب محمد خان اشرف، حسرت موہانی
دیوانِ مصحفی، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی
دیوانِ آتش، وحید قریشی، حسرت موہانی
دیوانِ جرأت، حسن عسکری، حسرت موہانی
انتخابِ غالب، مرتب سید اختر عباس
دیوانِ غالب (اردو) مع مقدمہ
غالب دیاں غزلاں (پنجابی) دلشاد کلانچوی
دیوانِ غالب (فارسی) مرتب وزیر الحسن
عابدی
دریچۂ سحر (کلام) جاوید ہوشیار پوری

# تھارنٹن وائلڈر

## ایک تنقیدی جائزہ

مصنف:۔ برنارڈ گریبانئیر
مترجم:۔ کمال احمد رضوی

ناشر: مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

اردو میں ترجمہ اور اشاعت کے حقوق ناشرین سے حاصل کیے گئے

میری لائبریری میں پہلی بار: ۱۹۶۹ء

طبع اول: دو ہزار

ناشر: بشیر احمد چودھری، ڈائرکٹر
مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

طابع: مکتبہ جدید پریس لاہور

THORNTON WILDER,
by, Bernard Grebanier Copyright 1964
by the University of Minnesota.

# تھارنٹن وائلڈر

تھارنٹن وائلڈر کو تین مرتبہ پلٹزر انعام سے نوازا گیا ہے۔ یہ اس کی مقبولیت کی علامت ہے مگر اس کی اصل مقبولیت یہ ہے کہ وہ ہمارے عہد کے زندہ و پائندہ ادیبوں میں شامل رہے ہے۔ اس کے بہت کم معاصرین کو اس بات کا علم ہوگا کہ اپنی غیر معمولی کامیابی کے باوجود وائلڈر کی زندگی تحیر آفریں حالات سے محروم رہی ہے۔

وائلڈر کے زمانے میں بے شمار ایسے مصنف گزرے ہیں جو "موضوع بحث" بنے رہے لیکن آج ان کی یاد ہمارے ذہنوں سے بالکل محو ہو چکی ہے۔ پھر ایک ایسے ادیب کا مقدر مختلف کیوں نظر آتا ہے جس نے کسی عام ادبی روش کی مخالفت یا پیروی کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی بلکہ اپنے الگ راستے پر چلتا ہے جس نے بظاہر کبھی اس شہرت کے حصول کی کوشش نہیں کی جو کبھی کبھار اسے نصیب ہوتی رہی ہے۔ اس کی شہرت کی کلید شاید وہ متعدد اہم

ظاہری تناقضات "PARADOXES" ہیں جو اس کی تحریروں سے فنکارانہ چابک دستی کی بدولت ہم آہنگ ہو گئے۔

وہ فطرتاً ایک رومانی ادیب ہے (اور کون صاحبِ تخیل ادیب رومانی نہیں ہوتا) اس نے ہمیشہ کلاسیک کو ذہنی طور پر خاص اہمیت دی ہے۔ اس کی تحریروں میں جذبات بڑے گہرے ہیں لیکن دہشت انگیز نہیں اس کے ہاں جذبات کی شدت ہیئت کو مجروح نہیں کرتی۔ دوسری طرف اس کا اسلوب آبگینے کی طرح صاف شفاف ہے جس کے اندر جلتی ہوئی شمع کبھی مدھم نہیں ہوتی!

اسے ہمیشہ عظیم موضوعات اور مضامین سے دلچسپی رہی ہے تاہم جہاں تک اظہار کا تعلق ہے اسے مختصر تصویروں کا نقاش کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنے ابتدائی فن پاروں کے دیباچوں میں یہ حقیقت واضح کرتا رہا ہے کہ اگر ادیبوں نے نمائش پسندی سے گریز کیا ہوتا تو آج ادب کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔ کیونکہ جو شاعر بیلے کی تحریر پر قادر ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ موسیقانہ مذہبی ناٹک پر بھی قدرت رکھتا ہو تاہم وائلڈ نے بذاتِ خود بہت کم ارفع ترین تصورات کا دامن چھوڑا ہے تاہم اگر اس کے دل میں موسیقانہ مذہبی ناٹک کی طویل بحروں میں طبع آزمائی کا خیال پیدا ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ اس نے پُرعظمت ہیئت آرائی کی بجائے اپنا سارا زور فن پارے کی داخلی و خارجی ہم آہنگی پر صرف کیا ہوتا جس کی بدولت فن پارہ ایک مربوط اور پُرکشش چیز بن جاتا۔ اس نے ہمیشہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی سمونے کی کوشش کی ہے وہ اپنی اولین تصنیف کے پیش لفظ میں اعتراف کرتا ہے کہ وہ تخیلات کی بلند پروازی کو مسلسل قائم رکھنے پر قادر نہیں"۔ اس کی تصنیفات کی وسیع

اور کشادہ فضا کی بنیاد ہئیت کی بجائے اچھوتے خیالات ہیں۔

تمام اچھے کتابی کیڑوں کی طرح اسے بھی ماضی سے محبت ہے لیکن اس کے ہاں ماضی کی از سرِ نو تخلیق کا زیادہ تر تعلق زمانہ حال سے ہے۔ اس نے کبھی ایسے فن پارے پر توجہ صرف نہیں کی جو صرف عجائب گھر کی زینت بننے کے قابل ہو۔ اس کے معاصرین میں سے کسی ادیب نے بھی اخلاقی مسائل کو اس مستقل مزاجی سے نہیں اپنایا جس کا اظہار وہ کرتا ہے تاہم وہ مُصلح نہیں ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے ہاں اخلاقی تعلیم جبر کی ایک صورت ہے۔ حالانکہ اس کے خیال میں اصل ترغیب حسن ہے۔

اس کے تجربات اور مشاغل نے اسے آفاقیت کا علمبردار بنا دیا ہے تاہم جو مقامیت اور واقعات کی ترتیب اس کے ہاں ملتی ہے کسی اور فنکار کے ہاں نظر نہیں آتی۔

اس نے امریکہ کے جدید نثری ادیبوں کی علاقہ پرستی سے گریز کیا ہے تاہم اس کے بہت سے ڈرامے اور ایک ناول اپنی ساری آفاقیت کو سلامت رکھنے کے باوجود مکمل طور پر امریکی ہیں۔

تھارنٹن نیون وائلڈر "THORNTON NIVEN WILDER MADISON" واقع وسکانسن "WISCONSIN" میں ۱۷ اپریل ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوا۔ اس نے ایسے والدین کے ہاں جنم لیا جن کے خاندان کے فرزند کی زندگی پر لازماً گہرا اثر تھا۔ اس کا والد امیس پارکر وائلڈر ایک اخبار کا مدیر اور ناشر تھا۔ وہ سدھر مذہبی آدمی تھا اور عیسائیوں کے ایک ایسے فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو کلیسا کی خود

مختاری کا قائل ہے۔

اس کی والدہ "ISABELLA THERNTON NIVEN" ایک پریسبی ٹیرین پادری کی لڑکی تھی۔ اس کے والد "AMOS WILDER" ہانگ کانگ میں امریکی قونصل جنرل کے عہدے پر فائز تھے اور تھارنٹن نے ۱۹۰۶ء میں چھ ماہ تک جرمن سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسی سال اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے برکلے "BERKELEY" ریاست کیلیفورنیا بھیج دیا گیا ۱۹۱۱ء میں وہ چین واپس آیا یہاں وہ شیفو "CHEFOO" کے ایک انگریزی مشن سکول میں رہائشی شاگرد کی حیثیت سے داخل ہوا اور ایک سال تک اسی سکول میں پڑھتا رہا ۱۹۱۲ء میں وہ دوبارہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ آگیا۔ یہاں وہ سب سے پہلے اوجائے "OJAI" (ریاست کیلیفورنیا) اور اس کے بعد برکلے ہائی سکول میں زیر تعلیم رہا یہیں سے ۱۹۱۵ء میں وہ گریجویٹ بن کر نکلا ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک اس نے اوبرلن کالج "OBERLIN COLLEGE" میں تعلیم حاصل کی۔ اس کالج میں داخل ہوتے ہی اس نے کالج کے رسالے "OBERLIN LITERARY MAGAZINE" میں لکھنا شروع کر دیا ۱۹۱۷ء میں وہ ییل "YALE" کالج میں داخل ہو گیا۔ اس نے والد نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد وہ نیو ہیون "NEW HAVEN" میں اپنے والد کے پاس آگیا۔ ادب کو اس نے ایک مشغلے کے طور پر اختیار کر لیا تھا اس لیے "YALE LITERARY MAGAZINE" میں اپنی زیادہ سے زیادہ ادبی کاوشیں چھپوانے لگا۔

اس کی نظر کمزور تھی۔ اس لیے متعدد کوششوں کے باوجود مسلح افواج میں بھرتی نہ ہو سکا جس سے اس کی بڑی دل شکنی ہوئی تاہم ۱۹۱۸ء میں اُسے ساحلی

توپ خانے میں جگہ مل گئی ۱۹۱۹ء میں وہ "YALE" واپس آگیا اور اگلے سال بی اے کی سند حاصل کرلی ۲۱-۱۹۲۰ء میں اس نے ایک سال روم میں امریکن اکیڈمی میں قیام کیا جہاں وہ "THE CABALA" کی تصنیف میں مصروف ہوگیا۔ امریکہ واپس آکر اس نے نیوجرسی "NEW JERSEY" میں "LAWRENCE VILLE" سکول میں فرانسیسی زبان پڑھائی اور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک اسی سکول میں یہی کام کیا تاہم اس عرصے میں اس نے دو سال تک تعلیمی کام چھوڑ کر صرف مطالعے اور تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ اس کے فوراً بعد اس نے "PRINCE TON" میں گریجویٹ سٹنے کی غرض سے پڑھنا شروع کیا اور ۱۹۲۶ء میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۶ء میں اس کی پہلی تصنیف "THE CABALA" شائع ہوئی۔ لیکن بعض نقادوں نے تو اسے یکسر نظر انداز کر دیا اور بعض نے بے حد سراہا۔ ۱۹۲۷ء میں "AMERICAN LABORATORY THEATRE" نے ایک ڈرامہ سٹیج کیا جس کا نام "THE TRUMPET SHALL SOUND" تھا۔ یہ ڈرامہ تھارنٹن نے اپنے کالج کے مجلہ "YALE LITERARY MAGAZINE" میں چھاپا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی تھی۔ اس کی جس تصنیف نے اُسے شب بھر میں شہرہ آفاق مصنف بنا دیا وہ اس کا ناول "THE BRIDGE OF SAN LUIS REY" تھا۔ اپنے زمانے میں اس کتاب کی بازار میں سب سے زیادہ مانگ تھی چنانچہ ۱۹۲۸ء میں اسے "PULITZER PRIZE" سے نوازا گیا۔ اس ناول کی فلم بھی بنی ایک ناول کی حیثیت سے اس کی بڑی تعریف کی گئی۔ مگر اس کے ساتھ ہی بھرپور تنقیص بھی ہوئی۔ اس کے بعد بازار میں اس قسم کے ناولوں کی بھرمار ہوگئی جس میں وائلڈر

کے مخصوص اسلوب کی نقالی کی جاتی تھی۔ اس اسلوب کے ذریعے چند کرداروں کو کسی حادثے کے ذریعے ایک ایسے لمحے میں جمع کر دیا جاتا تھا جسے اِن کی زندگی میں مرکزی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔

وائلڈر اپنی اچانک اور غیر متوقع شہرت کی وجہ سے اس قابل ہوگیا کہ اس نے تعلیمی کام چھوڑ دیا اور اپنے اصلی رجحان تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہوگیا۔ اب "THE CABALA" کا مطالعہ نئے سرے سے کیا جانے لگا جس سے اس کی تعریف و توصیف رہی اور ۱۹۲۸ء میں اس کی ابتدائی تصانیف میں سے منتخب چھوٹے کھیلوں کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا جس کا نام تھا "THE ANGEL THAT TROUBLED THE WATERS" اب وہ اس قابل بھی ہوگیا تھا کہ اپنی والدہ کی بہت پرانی آرزو کی تکمیل کر سکے اور اس کے رہنے کے لیے ایک گھر بنا سکے۔ اس نے ییل "YALE" یونیورسٹی کے احاطے سے چند میل کے فاصلے پر اپنی والدہ کے لیے عالیشان اور وسیع مکان تعمیر کرایا اور وہ آج بھی اسی مکان میں رہتی ہے۔

اس کے بعد اس نے یورپ کا ایک اور سفر کیا۔ اس سفر کے دوران میں اس نے "THE WOMAN OF ANDROS" لکھنا شروع کیا۔ واپس آکر وہ ملک بھر میں جگہ جگہ لیکچر دینے کے لیے نکل پڑا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک اس نے جزوی طور پر شکاگو یونیورسٹی میں تدریس کا کام کیا اور ساتھ ہی ہالی وُوڈ کی بہت سی فلموں کے لیے ڈراموں کے مکالمے بھی لکھے۔ یہ سال وائلڈر کی زندگی کے بے حد مصروف سال تھے۔ اس نے کیتھرین کارنل "KATHARINE CORNELL" کے لیے "ANDRE OBEY" کا ڈرامہ "LE VIOL DE LUCRECE" انگریزی میں منتقل کیا اور ایک

نیا ناول "HEAVEN'S MY DESTINATION" تحریر کیا ۱۹۳۵ء میں اس نے چند ماہ کے لیے ہوائی یونیورسٹی میں پڑھایا اور ابسن "A DOLL'S HOUSE" کو ڈرامے کی شکل دینا شروع کی جس میں "RUTH GORDEN" نے ۱۹۳۷ء میں ایک بڑے کردار کی حیثیت سے حصہ لیا۔ لیکن اسے ۱۹۳۸ء سے پہلے دوبارہ عوام الناس میں شہرت اور کامیابی حاصل کرنے کا موقع نہ ملا جس کی ابتدا لازماً ناکامی سے ہوئی تھی اس کے "OUR TOWN" کی نمائش بوسٹن تھیٹر میں کی گئی تو اس پر ایسے حوصلہ شکن تبصرے لکھے گئے کہ ایک ہفتے کے بعد اس کی نمائش روک دی گئی، لیکن اس کی نمائش نیویارک میں شروع ہوئی تو اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے مصنف کو ۱۹۳۸ء کا پلٹزر انعام عطا کیا گیا۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں "THE MERCHANT OF YONKERS" جس میں "JANE COWL" ایک نمایاں کردار کے طور پر شامل ہوا تھا ناکام ہو گیا اور چند ہفتوں کے بعد اس کی نمائش ختم ہو گئی۔ اگلے کئی سال تک وائلڈر جنوبی امریکہ میں امریکن محکمہ خارجہ کے نمائندے کی حیثیت سے لیکچر دیتا رہا اور ہالی ووڈ کے سینما کے لیے "THE SHAWDO OF DOUBT" کے مکالمے لکھتا رہا ۱۹۴۲ء میں اسے امریکہ کی ہوائی فوج میں بھرتی کر لیا گیا حالانکہ اس کی نظر کمزور تھی پھر بھی اسے بطور کپتان کمیشن مل گیا۔

فوجی ملازمت کے دوران ہی اسے اپنی زندگی کی تیسری زبردست کامیابی نصیب ہوئی جبکہ اس کے ڈرامہ "THE SKIN OF OUR TEETH"

کی نمائش کی گئی جس میں "FREDRIC MARCH, TALLULAH BANKHEAD"
اور "FLORENCE ELDRIDGE" نے کام کیا ۱۹۴۳ء میں وائلڈر کو اسی ڈرامے پر
تیسرا "PULITZER" انعام ملا۔
دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اس نے پہلے افریقہ اور پھر اٹلی میں فوجی خدمات
انجام دیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں ملازمت سے سبکدوشی تک امریکہ میں فوجی خدمات
انجام دیتا رہا۔ اس کی اگلی بڑی تصنیف اس کا ناول "THE IDES OF MARCH"
تھا۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد ۱۹۴۸ء میں وائلڈر نے ہارورڈ اور دوسری،
یونیورسٹیوں میں تدریس کا کام کیا اور ۱۹۵۵ء میں "THE MERCHANT OF YONKERS"
کو ترمیم کے بعد "THE MATCHMAKER" کے نئے نام سے پیش کیا تو
اسے انگلستان میں قبولِ عام نصیب ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں بھی اسے کامیابی
کے ساتھ پیش کیا گیا جبکہ "RUTH GORDON" نے اس میں ہیرو کی حیثیت
سے شرکت کی۔ ۱۹۵۵ء میں ایڈنبرگ کے فلمی میلے میں "THE ALCESTIAD"
کی نمائش کی گئی۔ "HINDEMITH" نے وائلڈر کے ایک ایکٹ کے ڈرامے "THE
LONG CHRISTMAS DINNER" کو ایک اوپیرا "OPERA" کی شکل دی اور
اسے ۱۹۶۱ء میں جرمنی کے شہر "MANNHEIM" میں پیش کیا۔ اسی طرح "LOUISE
TALMA" نے وائلڈر کے طویل ڈرامے "THE ALCESTIAD" کو اوپیرا "OPERA"
میں تبدیل کرکے سب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں "FRANKFURT AM MAIN"
میں پیش کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ایک ایکٹ کے تین نئے کھیل، اس کے ڈراموں کے
مجموعوں "THE SEVEN AGES OF MAN" اور "THE SEVEN DEADLY SINS"

سے پیسے گئے اور نیویارک میں دکھائے گئے۔ ۱۹۶۴ء کے اوائل میں "THE MATCH MAKER" کو ایک موسیقارانہ طربیہ کی صورت میں "HELLO, DOLLY" کو ایک موسیقارانہ طربیہ کی صورت میں "HELLO, DOLLY!" کے نام سے پیش کیا گیا جس میں "CAROL CHANNING" نے بطور ہیرو کام کیا۔

۱۹۶۲ء کے موسم بہار میں وائلڈر، آریزونا "ARIZONA" کے ریگستانی علاقے میں چلا گیا تاکہ اسے پرسکون ماحول اور تنہائی کے لمحات میسّر آجائیں اور وہ ان تصانیف کے کام میں مصروف ہو جائے جن کو وہ عرصے سے معرضِ التوا میں ڈالتا آیا تھا۔ اس کی بہن "ISABEL WILDER" ایک صاحب طرز ناول نگار ہے، وائلڈر کو اس سے بہت پیار ہے ازبیلا اس کے نجی معاملات کی نگران ہے وہ وائلڈر اور اس دنیا کے درمیان جو اس کی تخلیقی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ رکاوٹ ڈالنا چاہتی ہے ایک غیر جانب شخص کی حیثیت سے حائل ہے۔ وائلڈر کی اس مشفق بہن نے ایک مرتبہ میرے سامنے اعتراف کیا کہ اسے کتاب لکھنا ہو تو وہ اس مقصد کے لیے ایک ایسے مقام پر رہائش اختیار کرنا بہتر سمجھتا ہے جہاں اس کا کوئی آشنا نہ ہو اور جہاں صرف اجنبی لوگوں کے ساتھ کبھی کبھار تفریح طبع کے لیے گپ شپ مار سکے۔

تھارنٹن وائلڈر کی تصانیف کے ناموں پہ ہی ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے کارناموں میں بڑا تنوع ہے ایک ایسا تنوع جس سے اس کے معاصرین مثلاً "THOMAS WOLFE" اور بعض نیچری ادیب یکسر محروم ہیں جو ایک ہی موضوع پر بار بار نئے عنوانات کے تحت لکھتے کے

عادی ہیں۔وائلڈر کے مخصوص تنوع میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے اپنے مزاج اور ذہن کی انفرادی جھلک دکھائی دیتی ہے۔خواہ وہ ہمیں جدید یا قدیم روم میں لے جائے یا موجودہ دور کے "NEW HAMPSHIRE" یا "MISSOURI" کی سیر کرائے یا چکرا دینے والی رفتار سے ہمیں صدیوں کا سفر طے کرائے۔اس کی تصانیف میں ہر جگہ اس کا اپنا مخصوص ہاتھ مصروف کار نظر آتا ہے۔

اس کے ابتدائی فن پاروں کا مجموعہ "THE ANGEL THAT TROUBLED THE WATERS" (جو اس وقت چھپ سکا جب "THE BRIDGE OF SAN LUIS REY" کو کامیابی نصیب ہو گئی) اس کی بعد کی بے مثال کامیابیوں کی نشان دہی نہیں کرتا اس مجموعے میں "تین منٹ" کے سولہ کھیل شامل ہیں تاہم انھیں کھیل ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔یہ حقیقت سٹیج کی ہدایات سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے (مثال کے طور پر ان میں سے ایک کھیل میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ "JUDAS" تیس چاندی کے سکے ایک ہاتھ سے اوپر کی طرف اچھالتا ہے اور وہ فضاؤں میں گردش کرتے ہوئے اپنے وسیع سائے ستاروں پر ڈالتے ہیں اور خلا کے وسیع و دُودکش میں سے ہمیشہ گھومتے رہتے ہیں) زیادہ سنجیدگی سے بات کی جائے تو یہ تمام فن پارے اتنے مختصر ہیں کہ انھیں سٹیج پر پیش ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

تاہم یہ فن پارے شاعرانہ اور اخلاقی تخیل کے مظہر ہیں جو وائلڈر کی ذہانت کے دو اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی تھیٹر کی طرف اس کی کشش

(جہاں وہ چند سال بعد ایک ایکٹ کے ڈراموں اور ناول میں گوناگوں تجربات کے ذریعے اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے والا تھا) دوسرا پہلو اس کے اپنے الفاظ میں اختصار کی خواہش تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ ایک مرتبہ فضول تکرار پر تلملا اٹھا تھا۔ اور "بے معنی تمہیدی پیرے" شستہ مگر بے معنی عبوری حصے اور اکثر تحریروں کے خاتمے پر فالتو خلاصے (گویا وہ تمام حشو و زوائد جو آج بھی ہمارے مدرسوں میں اعلیٰ مضمون نویسی کے نمونے شمار کیے جاتے تھے) اسے پریشان کر دیتے تھے اگرچہ یہ فن پارے اتنے مختصر ہیں کہ ان پر ڈرامہ ہونے کا گمان نہیں ہوتا، لیکن ان سے اتنا ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ فن کار ایک ایسے اصول کا شعور رکھتا ہے جسے وہ پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے۔

ان ابتدائی ڈراموں کے لیے اس نے جو واقعات منتخب کیے ہیں وہ اس کی حوصلہ مندی پر شاہد نہیں ان سولہ مختصر ڈراموں میں تین ڈرامے اپنی مخصوص خوبیوں کی بنا پر ہم پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں "AND THE SEA SHALL GIVE UP ITS DEAD" اس کا پہلا کھیل ہے۔ اس میں ایک شہزادی تھیٹر کا پروڈیوسر اور ایک پادری قیامت کے دن سے خوفزدہ ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں جہنم کی آگ میں گرنے سے پہلے وہ اپنے خاص امتیازی خدوخال سے محروم ہو جائیں گے۔

دوسرا ڈرامہ ہے "NOW THE SERVANT'S NAME WAS MALCHUS" یہ آسمانی روشنی کی چندھیا دینے والی ایک اور جھلک ہے جس میں "MALCHUS" ہمارے خداوند سے التجا کرتا ہے کہ اس کا نام نوحِ مقدس سے مٹا دیا جائے اور ہمارے خداوند اس کی دنیاوی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں (میرے دعدے اتنے

"تنوع تھے کہ ان کے پیش نظر میں یا ایک مقدس ہستی ہوں یا ایک مضحکہ خیز ہستی)
اور تیسرا کھیل ہے "MOZART AND THE GREY STEWARD" اس کھیل
میں وائلڈر نے اس مشہور قصے کو دہرایا ہے جس میں ایک بیمار نغمہ ساز مناجات
تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس تحریر کے مصنف
کا نام صیغۂ راز میں رکھنے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ کیونکہ یہ نظم لاکھوں سوئے ہوئے لوگوں
کی آواز ہو گی جن کے حقوق کی ترجمانی کرنے کے لیے "MOZART" کے سوا اور
کوئی نہیں ہے۔

زیر نظر مجموعے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اخلاقی اقدار سے
گہری وابستگی پائی جاتی ہے (اخلاق آموزی یا اخلاقی اور مذہبی رسومات کی پابندی
کی تبلیغ نہیں) اور یہ چیز وائلڈر کی اعلیٰ ترین تحریروں کی نمایاں مقبولیت ہے ان
میں سے اُس انداز نگارش کے واضح اشارے بھی ملتے ہیں جس سے اس نے اپنے
بعد کے عظیم ڈرامے "THE SKIN OF OUR TEETH" میں غیر شعوری
طور پر نہایت چابک دستی سے کام لیا ہے یا اس کے ڈرامے "PROSERPINA
AND THE DEVIL" میں دل فریب کھوکھلی سنجیدگی کا انداز اور اس کے دونوں
ڈراموں "AND THE SEA SHALL GIVE UP ITS DEAD" اور "HOW
THE SERVANT'S NAME WAS MALCHUS" میں اس کے اسلوب کی سہل نگاری
نمایاں ہے۔ جس طرح "BEE THOVEN" پانو پر گائے جانے والے گیت
"HAYDNESQUE OF US2" اور اس کی حالیہ عشقیہ نظموں کے درمیان طویل
فاصلے کی موجودگی کے باوجود اس کی ابتدائی تصانیف میں ایک نوجوان نثر کی

غراہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح سولہ مختصر ڈراموں کے اس مجموعے میں اس کی آئندہ تصانیف کے تیور جھلکتے نظر آتے ہیں۔

بعض اعتراضاف کے باوجود "THE ANGEL THAT TROUBLED THE WATERS" کی اشاعت کا جواز موجود تھا۔ کسی اور چیز سے قطع نظر وائلڈر نے اس کے لیے جو بصیرت افروز پیش لفظ لکھا ہے اور اس کی اشاعت کے جواز کے لیے وہی کافی ہے۔ اس فن پارے کی ان خوبیوں کے علاوہ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کچھ اور باتیں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ وائلڈر کہتا ہے کہ ایک فن کار "کو علم ہوتا ہے کہ زندگی کو بہترین صورت میں کرنے کا کون سا طریقہ ہے" اور وہ اس کا بھی شعور رکھتا ہے کہ وہ ایسی مثالی زندگی بسر کرنے سے کہاں تک قاصر ہے۔ یعنی اسے اس امر کا احساس ہے کہ وہ صحیح معنی میں زندگی بسر کرنے میں ناکام رہا ہے اس لیے وہ اس ملامت کا داغ دھونے کے لیے کوئی نہ کوئی کارِ خیر یا نیکی کرتا ہے۔" ایک غیر خالق فن کار کو اپنی ناکامی کا ہر وقت شک رہتا ہے اور وہ "گاف کے کھیل، محبت یا تجارت کے کاروبار" میں مصروف رہ کر دل کو جھوٹی تسلیاں دیتا ہے۔ مصنف کو اس بات کا احساس ہے کہ اس کا عہد مذہبی تصانیف کے بارے میں غیر ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے اس لیے وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اسی قسم کی تخلیقی کوششوں میں نام پیدا کرے گا۔ یہ اعلان اعلیٰ درجے کی خود شناسی ہے وائلڈر ان ہی معنوں میں مذہبی ہے جن معنوں میں "AESCHYLUS" "مذہب پرست ہے۔ وہ اخلاق آموزی کے مقصد سے سراسر لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے۔

"THE CABALA" ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تو اس کی خوبصورت نثر کی بڑی تعریف

کی گئی اور اس کے "جادو اثر مشاہدات کے جواہر اور سحر انگیز اسلوب" کو بہت سراہا گیا۔ تاہم "نیویارک ٹائمز" نے تسلیم نہ کیا کہ اس میں ایسا مواد بافراط موجود ہے جو دُنیا کے ہر خاص وعام کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ مانا کہ "THE CABALA" اس مرتبے کی کتاب نہیں جسے وائلڈر کی بہترین تصانیف کے ہم پلہ قرار دیا جا سکے جن میں جگہ جگہ اس کے اسلوب کی پختگی اور اس کی فصاحت و بلاغت کی شہادت ملتی ہے۔ اس تصنیف میں اس نے ابھی مکمل وحدت کی ان باریکیوں کو نہیں چھوا ہے جن پر قدرت کا ثبوت وہ اپنی اگلی کتاب میں پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کی بڑی خامی انفرادی واقعات میں باہمی ربط کا فقدان ہے اس لیے اپنی بہت سی اعلیٰ خوبیوں کے باوصف ہم اسے ایک ناول قرار نہیں دے سکتے۔

بعض حضرات کو اس کتاب پر "HENRY JAMES" کا اثر غالب نظر آیا ہے اور بعض حضرات کے خیال میں اس کا مصنف "PROUST" اور "CABELL" سے متاثر ہے تاہم وائلڈر کے ہاں کسی دوسرے مصنف کے اثر کی تلاش فضول ہے۔ تمام بلند پایہ مصنفوں کی طرح اس نے جو کچھ پڑھا ہے اُسے پوری طرح ہضم کر لیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی اپنی تخلیق ہے۔ ہاں ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اپنے یک سالہ روم کے قیام کے دوران میں اس نے جو مشاہدات کیے وہ ایک ہمہ گیر قوت بن کر اس پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اس کی نشاط افزا کتاب کے پہلے صفحے پر ہی ہم دنیائے قدیم کی فضا میں سانس لینے لگتے ہیں یہ ورجل "VIRGIL" کا وطن ہے اس ملک کے کھیتوں کی طرف سے جو بادِ نسیم چلتی ہے اس کا ہر جھونکا ورجل کی گہری آہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس خطۂ ارضی نے

اپنے عظیم شاعر کو شاعرانہ جذبہ عطا کیا وہ انجام کار خود بھی اس سے اپنا جذبۂ مستانہ حاصل کرتی ہے۔" چند تنقید نگاروں نے اس ناول کے بڑے کرداروں کو قدیم دیوی دیوتاؤں سے مماثلت دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں "CARDINAL" یا بڑا پادری "JUPITER" یعنی مشتری ہے "ALIX" زہرہ ہے اور "BLAIR" اس کا محبوب "ADONIS" ہے "MARCANTONIO" یونانی "PAN" دیوتا ہے مس گریر "GRIER" "DEMETER" دیوی ہے اور "SAMUELE" "عطارد" "MERCURY" ہے۔ یہ خیال تو بہت حسین ہے لیکن اگر اسے مان لیا جائے تو ہمارے لیے کچھ ایسا منفعت بخش ثابت نہیں ہوتا۔ جو چیز نوجوان ناول نگار کو بطورِ خاص متاثر کرتی ہے وہ مردوں اور عورتوں کے محدود طبقے کی علیحدگی پسندی ہے مثلاً "CABALA" جو کتاب کا عنوان ہے۔ مردوں اور عورتوں کا یہ گروہ قدیم وضع دار شرفا کی طرح پرانے متروک تصورات کو سینوں سے چمٹائے بیسویں صدی کے لوگوں کی خشک تجرباتی زندگی سے الگ تھلگ نظر آتا ہے "THE CHERRY ORCHARD" کے چیخوف کی مانند، اسے ان کے طور طریقوں کا کھوکھلا پن لیکن ظاہری کشش نزاکت اور وجاہت صاف نظر آتی ہے۔ اسے ان سے ہمدردی ہے لیکن وہ ان کو پسندیدگی یا حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ پس منظر میں جدید اقدار کا کھوکھلا پن جھلکتا ہے جس کا آغاز دوسرے صفحے پر ہی ہو جاتا ہے جو پہلے صفحے کی قدیم رومی روحانی اقدار کے تضاد کے طور پر ان تین اطالوی باشندوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو نیویارک میں بیس سال تک دکان داری کرنے کے بعد وطن واپس آرہے ہیں۔ "ان کی بچتیں جواہرات کی صورت میں ان کی انگلیوں پر" موجود ہیں۔

"THE CABALA" میں جو تین کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی کہانی ایک قدیم خاندانی شہزادے "MARCANTONIO" کے متعلق ہے جو پہلے سے جنسی افراط میں اس شدت سے مبتلا ہے کہ اس کی ماں کے دل میں خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس نے شہزادے کے لیے جو رشتہ تلاش کیا ہے۔ ٹوٹ جائے گا۔ وہ کہانی بیان کرنے والے ایک نوجوان امریکی سے مخاطب ہے جسے "CABALA" نام لگانگر "SAMUELE" پکارتی ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کے فرزند کی اصلاح میں اس کا ہاتھ بٹائے یہ جان کر "SAMUELE" کے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ کہ معتبر "CARDINAL" جو اپنے حلقے کا روحانی سربراہ ہے "MACANTONIO" کی اخلاقی نجات کی کوئی فکر نہیں کرتا۔ اسے صرف یہ فکر دامن گیر ہے کہ جب تک شادی نہیں ہوتی شہزادے کی حرکات حد سے بڑھنے نہ پائیں۔ بوڑھے پادری کی سمجھ میں نوجوان کی پریشانی کا راز نہیں آتا۔ یہ نوجوان پانچ چھ واردات کیوں نہیں کر سکتا اور مواخذے سے کیوں بچ نہیں سکتا۔ غور و خوض کرنے پر امریکن سوچتا ہے کہ اس نے "CARDINAL" سے یہ بات سیکھی ہے کہ انسانی طبیعت کے جھکاؤ کے خلاف کوئی کام کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تاہم وہ انتہا پسند مذہبی مصلحین کی طرح نوجوان شہزادے کو بداخلاقی کی زندگی سے توبہ کرانے کی ٹھان لیتا ہے۔ پہلے پہل اسے بڑی نمایاں کامیابی ہوتی ہے لیکن انجام کار حیرت کی وجہ سے "MARCANTONIO" اپنی بہن کا مضحکہ خیز چیلنج قبول کر لیتا ہے اور بدکاری کے کاروبار میں حصہ دار بن جاتا ہے اس خوفناک فعل کے بعد سوائے خودکشی کے اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

دوسری کہانی میں "SAMUELE" کا ایک امریکی دوست "JAMES BLAIR" غیر شعوری طور پر "VILLIAN" یعنی بدی کے کردار میں منتقل ہو جاتا ہے۔جہاں تک وائلڈر کی تصنیف کا تعلق ہے اس میں حقیقتاً کوئی بدی کا کردار نہیں ہے تاہم "JAMES BLAIR" کو ایک حد تک بدی کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔
"BLAIR" ہر اس مظہر کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے جو قدامت سے وابستہ ہے، وہ روحانی طور پر بے ریا عالم اور گرد کی مانند زاہد خشک ہے۔ الغرض وہ اپنی یادداشت کے روزنامچوں کے صفحات کو اپنی دریافتوں سے بھر دیتا ہے تاکہ یہ کتابچے بعد میں ہارورڈ لائبریری کو عطیے کے طور پر پیش کیے جائیں۔ جہاں یہ کتابیں اپنے الہام کی بناء پر "لافانی شاہ کار کا خطاب حاصل کر لیں گی"۔ وہ حقیقت کی تلاش کا آغاز "کسی نئی چیز سے بچنے کی خواہش" کے زیر اثر کرتا ہے۔ یہ "ALIX" کی بدقسمتی ہے کہ شہزادی "D'ESPOLI" کو "BLAIR" کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے جو "CABALA" کی نظر میں حسین وجمیل، بذلہ سنج اور قابل پرستش شخصیت ہے۔ بات کچھ یوں معلوم ہوتی ہے کہ شہزادی اس کے زہد خشک کے جھانسے میں آجاتی ہے لیکن "BLAIR" نہ تو اس قابل ہے کہ اس کی قدر کر سکے اور نہ اس میں یہ اہلیت ہے کہ اسے سمجھ ہی سکے۔ جس کی زندگی صرف محبت کے سہارے سانس لے رہی ہے۔ اس کا شہزادی کی محبت کو ٹھکرا دینا شہزادی کی حساس اور نازک طبیعت کے لیے ایک مہلک صدمہ ثابت ہوتا ہے۔
تیسری کہانی ایک دراز قامت، دُبلی پتلی شاہ پرست فرانسیسی عورت "ASTREE LUCE CARDINAL" سے تعلقات کے بارے میں ہے۔ اس شاہ

پرست عورت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنی موت سے پہلے یہ اعلان سن لے کہ بادشاہت کا آسمانی حق کلیسا کا لافانی اصول بن گیا ہے۔ یہ سادہ دل عورت اسی سالہ بوڑھے پادری " CARDINAL " کی پرستش کرتی ہے اور یہ نہیں سمجھتی کہ کارڈینل کے منطقی ذہن نے بتدریج اس کے عقیدے کو بدل کر رکھ دیا ہے اور وہ اس کی خاطر خدا کی ہستی ہی کا خاتمہ کر دیتا ہے" بڑے پادری کے اس فعل کے مقابلے میں قتل کا ارتکاب بچوں کا کھیل تھا" اس سادہ دل عورت کے لیے دنیا کی بنیادیں ہی تباہ ہو گئی ہیں اور وہ "ARDINAL" کو ایک شیطان تصور کرنے لگتی ہے حتیٰ کہ ایک دن بندوق اٹھا لیتی ہے اور اس پر گولی چلا دیتی ہے، لیکن بے چاری کا نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ یہ سوچ کر بہت نادم ہوتی ہے کہ اگر اس کی گولی نشانے پر ٹھیک جا بیٹھتی تو اس نے پادری کے ظلم کے مقابلے میں اُسے" بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہوتا" اس لیے وہ دونوں آپس میں راضی نامہ کر لیتے ہیں کہ کوئی فعل اتنا زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتا جسے محبت سمجھ نہ سکے یا ختم نہ کر سکے" اس سمجھوتے کے بعد" وہ اپنی زندگیاں نئے سرے سے دوبارہ شروع کرتے ہیں" یہ باب ناول کا نہایت پُرجوش اور اثر انگیز حصہ ہے۔

چونکہ " THE CABALA " ایک صمیمانہ جذبے کے تحت لکھی گئی ہے اس لیے وہ مزاج اور دانش کے قیمتی جواہرت سے مرصّع ہے" اس عورت نے ایک مجھن لکھا اور انھوں نے اسے سلطنتِ برطانیہ کی شہزادی بنا دیا" وہ ہر وقت نائب پادری اور بیواؤں کے جھرمٹ میں گھری رہتی تھی جو اس کے

ادنیٰ اشارے پر کھڑے ہو جاتے، جھومتے اور کیک پیش کرتے تھے)" سب سے زیادہ قابلِ غور وہ کردار ہیں جو بڑی سوچ سمجھ کے بعد تخلیق کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ کردار بھی قابلِ توجہ ہیں جو پیش منظر میں دار و نہیں ہوتے جیسی کہ امیر کبیر "MISS GRIER" جو تنہا سنے اور راتیں سہاگ کر کاٹتی ہے اور لوگوں کو اپنے ساتھ صبح کا ذب تک ٹھہراتے کے لیے شیمپین اور موسیقی کا لالچ دیتی ہے۔ اس طرح "DUCHESS D. AQUILANERA" کا کردار ہے یہ ایک سیاہ فام تیز نگاہ خاتون ہے۔ جس کے پیلے غلیظ ہاتھ ہر وقت موتیوں کے نانسے سے ڈھکے رہتے تھے اسی طرح فرانسیسی اکیڈمی کا "LERY BOGARD" جس کا چہرہ "وسیع مطالعے اور پُرتکلف غذا سے پیدا شدہ نزاکت کا آئینہ دار ہے" یہ کتاب بڑی نابالغ مرقع اخلاق و آداب ہے۔ اس میں صرف ایک پیرا ایسا ہے جس کو اس سے خارج کر نا بہتر تھا اور وہ پیرا روم میں کیٹس " KEATS " کی وفات کی تفصیلات کے متعلق ہے جن سے ہر شخص واقف ہے لیکن ان کو ایک بدبدشاعر سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ پیرا ایک پختہ نگار اور بالغ نظر مصنف کے فن پارے میں کسی مبتدی کی تخلیق معلوم ہوتا ہے۔

"ایک ننھا منا شاہ کار" "احساسات اور ہمدردی سے بھر پور" "ایک پُر وقار ناول" ایک ایسا ناول جس کے اسلوب کی پُرفریب نفاست کے نیچے مرمریں گہرائیاں چھپی ہوئی ہیں" یہ چند ایک ناقدانہ کلمات جن سے ۱۹۲۷ء میں "THE BRIDGE OF SAN LUIS REY" کا خیر مقدم کیا گیا۔ اب وقت نے ان خیالات کی تصدیق کر دی ہے ایک ایسے دور میں جب کہ تجربی ناولوں کی بھر مار ہے جن کا مقابلہ "JAMES BRANCH

" CABELL " نے تن تنہا کیا تھا۔ وائلڈر نے ایک بہ حیثیت قصہ گو کے خاموشی سے ایک ایسے ادیب کا مقام حاصل کر لیا جو نہ تو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی عکاسی ہی پر اکتفا کرتا ہے اور نہ " CABEL " کی طرح تجربے کی حقیقتوں سے شعوری طور پر راہ فرار اختیار کرتا ہے۔

وائلڈر کی دوسری کتاب میں اس کی ہمہ گیر ذہانت نے واقعات و مقامات کی ترتیب، قصہ گوئی اور لب و لہجہ میں جو انداز اپنایا ہے وہ اس کی پہلی تصانیف سے یکسر مختلف ہے تاہم اس میں بھی وہی مصنف صاف نظر آتا ہے جس کے سامنے اخلاقیات سب سے بڑا مسئلہ ہے اور جس کی نثر ایک ایسا مرقع ہے جس میں تصنع کی جھلک تک محسوس نہیں ہوتی۔ ایک بار پھر اس کے پاس کہانیوں کی وہ لڑی ہے جنہیں وہ مسلسل بیان کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ وہ ایک ایسی وحدت کے حصول پر کامیاب ہو جاتا ہے جو حقیقتاً ایک ناول کی امتیازی خصوصیت ہے اور یہ وحدت وہ نہ صرف ان سوالات کے ذریعے حاصل کرتا ہے جو اس کتاب میں اٹھائے گئے ہیں بلکہ ایک کہانی کے کرداروں کو بڑی چابک دستی سے دوسری کہانیوں کے کرداروں کی تقدیر سے مربوط کر کے بھی پا لیتا ہے۔

جنوبی امریکہ کی ریاست پیرو میں شہر " IMA "، اور " CUZCO " کی درمیانی شاہراہ پر بید کے پل پر سے پانچ انسان ۲۰ جولائی ۱۷۱۶ء کے دن گزر رہے تھے کہ ایک خوفناک حادثہ پیش آیا اور وہ ہمیشہ کے لیے خلیج " GULF " کی گہرائیوں میں اُتر گئے۔ اس ناول میں اس حقیقت کی تلاش کا بیڑا اٹھایا گیا ہے کہ یہ حادثہ (بشرطیکہ اسے حادثہ کہا جا سکتا ہے) خاص طور پر ان پانچ افراد کو کیوں پیش آیا۔ کیا یہ ایک ناگہانی حادثہ تھا؟ کیا اس

کے پس منظر میں خدا کا ہاتھ تھا یا یہ پانچوں ہستیاں کسی نہ کسی طرح اپنی موت کی خود ذمہ دار نہیں؟ وائلڈر اپنی کہانی بیان کر چکتا ہے تو وہ ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ ان میں سے کوئی واحد جبر اس قسم کے واقعے کی ذمے دار نہیں ہے۔ بلکہ ان تینوں سوالوں کا مشترکہ جواب ہی، اس کی وضاحت کر سکتا ہے یہ جواب پیش کرنے کے بعد وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ انسانی تجربے کی "پُراسریت" سائنس اور عقیدے کی متعینہ حدود سے ماورا ہے۔ ایک اور اچھوتے منصوبے کے ذریعے بھی زندگی کو پُراسرار دکھایا جاتا ہے۔ یونانی معابد کی غیبی آواز کی طرح وائلڈر ان سوالوں کا براہِ راست جواب نہیں دیتا۔ لیکن وہ ایک ایسے سوال کا براہِ راست جواب دیتا ہے جو آج تک پوچھا نہیں گیا اور جو پوچھا جانا چاہیے تھا اور وہ سوال یہ ہے "کیا محبوب سے دل برداشتہ ہو جانے کی صورت میں محبت ضائع نہیں ہو جاتی"۔ دوسرے سوالات کی تحقیقات کے دوران میں اس سوال کا جواب چپ چاپ ایسے انداز میں دے دیا جاتا ہے۔ جو جذبہ انسانیت سے مملو لیکن جذباتیت سے مبّرا ہے "MARQUESA DE MONTEMAYOR" اپنی دختر "CLARA" سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ لیکن "CLARA" اپنی ماں کے شدتِ جذبات سے بیزار ہو کر مادرانہ محبت سے نجات کی راہ ڈھونڈ نکالتی ہے اور ایک شریف زادے سے شادی کر کے ہسپانیہ چلی جاتی ہے اپنی دختر "CLARA" کی سرد مہری سے آگاہ ہونے کے باوجود "MARQUESA" ماں کی محبت کو ایک مذہب کا رنگ دے دیتی ہے "اس حقیقت کے احساس نے کہ اس کی محبت کا جواب سرد مہری ہوگا" اس کے خیالات پر وہی عمل کیا جو ایک طوفان پہاڑ کی چوٹیوں پر کرتا ہے سب

سے پہلے اس کے مذہبی عقائد صاف ہو گئے کیونکہ وہ کسی خداوندیا کسی لافانی ہستی سے یہی التجا کر سکتی تھی کہ" اسے ایک ایسا مقام عطا کر دیا جائے جہاں لڑکیاں اپنی ماؤں سے محبت کرتی ہیں۔" اور اس کے ساتھ ہی اس کی سب سے بڑی تمنا ہے کہ " CLARA " اپنی زبان سے کہے کہ "تم تمام ماؤں پر فوقیت رکھتی ہو" اس نے اپنی لڑکی کے نام جو خط لکھے ہیں وہ بعد میں ہماری زبان کا کلاسیکی سرمایہ بن گئے ہیں (یاد رہے کہ وائلڈر کے ذہن میں مادام " DE SEVIGNE " کے خطوط ہیں کیونکہ ان میں "دل کی تحریروں" کے علاوہ اسلوب بھی پورے کمال پر ہے ان خطوط کے جواب میں " CLARA " کے خطوط "صاف، صاف دل کو ٹھیس پہنچانے کی مہارت" کے مظہر ہیں۔ شہر کے عام باشندے " MARQUESA " کے مطالعے اور ادبی جوہر سے بے خبر ہیں۔ وہ اسے صاف ایک سر پھری عورت سمجھتے ہیں جو حد سے زیادہ شراب پیتی ہے اور جسے جیل اور جرائم کی تحقیقات کی عدالت کے حوالے کر دینا مناسب ہے۔

" SANTA MARIA " کی خانقاہ کی نیک سیرت اور باعمل راہبہ دن رات عبادت میں مشغول رہتی ہے اس کی نگرانی میں ایک کم سن لڑکی " PEPITA " پرورش پا رہی ہے " MARQUESA " اس ننھی راہبہ کو رفیق تنہائی کے طور پر لے آتی ہے " PEPITA " اپنے نئے ماحول میں خوش نہیں اور راہبہ کی محبت کے لیے ترستی رہتی ہے کیونکہ وہ راہبہ کو نہایت پُرخلوص جذبے کے ساتھ چاہتی ہے۔ وہ راہبہ سے ایک خط میں التماس کرتی ہے۔ کہ اسے خانقاہ میں واپس بلا لیا جائے، لیکن وہ اس ڈر سے اس خط کو ڈاک میں نہیں ڈالتی کہ کہیں راہبہ یہ خیال

نہ کرے کہ وہ بہت خود غرض ہے " MARQUESA " یہ خط پڑھتی ہے اور اس کے مطالعے سے اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے خود اپنی دختر " CLARA " سے اظہارِ محبت میں کس قدر انانیت کا مظاہرہ کیا تھا اور ننھی " PEPITA " کی محبت میں کس قدر حوصلہ مندانہ عجز وانکسار ہے۔ وہ سمجھ جاتی ہے کہ اس نے " CLARA " کی خاطر نہیں بلکہ اپنی ذات کی خاطر محبت کی ہے اب وہ دوبارہ اس کام کی ابتدا کے لیے تیار ہے۔ دودن کے بعد " MARQUESA " اور " PEPITA " دونوں اس پل پر سے گزر رہی ہوتی ہیں کہ وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

جڑواں بھائیوں " MANUEL " اور " ESTEBAN " نے بھی اسی خانقاہ میں پرورش پائی ہے۔ ان دونوں میں ایک ایسی قربت پیدا ہو چکی ہے اور جو ناقابل شکست ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی اس درجہ خوفناک حد تک ضرورت ہے۔ کہ اس سے اس طرح معجزات رونما ہوتے ہیں جس طرح کم د بادّو الابلاغ برق اگن کرتا ہے " CAMILA " ایک اختلاط پسند لیکن ذہین ایکٹرس ہے۔ جس کے نزدیک محبت کے معنی صرف البساجذبہ ہے جس کا اظہار سٹیج پر کیا جاتا ہے وہ " MANUEL " کے پاس خط لکھوانے آتی ہے اس بہانے وقت نکال کر وہ اپنی ہوس کاریوں کی تکمیل کرتی ہے۔ جس کا اس کے مالک " VICEROY " کو علم نہیں " MANUEL " کو اس سے محبت ہو جاتی ہے چونکہ یہ محبت فضول تھی۔ اس لیے اس کے انجام کے خیالات کا اس پر منفی اثر پڑا ہے۔ وہ اپنی محبت کا علم اپنے بھائی کو نہیں ہونے دیتا وہ ایسی کوئی بات نہیں کرتا جس سے اس کے بڑے بھائی " STEBAN "

کسے پلے کچھ پڑے۔ کیونکہ موخرالذکر کے دل میں تو صرف بھائی کی محبت کے لیے جگہ ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف پر بڑے بھائی کو بہت صدمہ ہوتا ہے کیونکہ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ "مکمل محبت کے باوجود ایک فریق دوسرے سے مقابلتاً کم محبت کرے"۔

"MANUEL" کے خون میں زہریلا مادہ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ اس بیماری کی وجہ سے مرجاتا ہے۔ اپنے بھائی کی وفات پر "ESTEBAN" کے دل کو اتنا صدمہ پہنچتا ہے کہ اسے کوئی شخص تسکین نہیں دلا سکتا۔ اس کی سب سے گہری دوست راہبہ بھی اس کے رنج و غم کو ہلکا نہیں کر سکتی کپتان "ALVARADO" جو دنیا کا سفر اس غرض سے کر رہا ہے کہ وہ کسی طرح اپنی پیاری بچی کی موت کے غم کو بھلا سکے "ESTEBAN" کو تقریباً رضامند کر لیتا ہے کہ وہ پیرو سے ہجرت کر جائے۔ یہ نوجوان نیم رضامندی کے بعد خودکشی کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ شہر کو نہیں چھوڑ سکتا جہاں اس کا بھائی دفن ہے۔ کپتان اسے بچاتا ہے، وہ ہچکیاں لیتے ہوئے فرش پر گر جاتا ہے اور چلاتا ہے "میں اکیلا ہوں اکیلا۔ اکیلا" آخر میں وہ کپتان کی معیت میں بحری سفر کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اگلے دن "ESTEBAN" بندرگاہ کی طرف جا رہا ہوتا ہے جبکہ دوپہر کے وقت اس پل پر سے گزرتا ہے اور حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔

بچیا "PIO" جامع صفات کردار ہے۔ وہ گانا سکھانے والا، اسٹیج گیسنز ڈائش، قاری، سیکرٹری، نقاصد، ساہوکار اور اداکارہ "CAMILA" کا خادم ہے۔ بیس کے سن کو پہنچنے پر اس نے اپنی زندگی کے تین مقاصد ٹھہرا لیے تھے اور وہ

مقاصد یہ تھے۔ اولاً ہر فن مولا متنوع پسند، پُراسرار اور عالم مطلق بنا رہنا، ثانیاً قیمتہ خوبصورت عورتوں کی صحبت میں رہنا" اور ثالثاً ایسے اشخاص سے قریبی تعلقات رکھنا جو ہسپانوی ڈرامے کی شاہکار تحریروں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہیرو میں پرانی دنیا سے وارد ہوا تھا اسے " CAMILA PERICHOLE " کی ذات میں اپنی تینوں خواہشات کی تکمیل کی صورت نظر آئی۔ اس نے اس اداکارہ کو بارہ برس کی عمر میں دریافت کیا اور اسے اعلیٰ درجے کی فن کارانہ تربیت دی۔ دونوں میں نہایت پُرخلوص دوستی ہے حالانکہ جسمانی لحاظ سے دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ پیرو میں مذہبی تھیٹر کا معیار اتنا بلند کر دیں کہ وہاں تک ان کے پیش رو کی رسائی بھی نہ ہوئی ہو وہ سٹیج پر " CAMILA " کی ہر لطیف ادا پر نکتہ چینی کرتا ہے لیکن اس کے ناجائز جنسی تعلقات کے بارے میں کبھی پریشان نہیں ہوتا کیونکہ اس کے نزدیک دنیا میں یہ بات اس حسین عورت کے لیے معیوب نہیں جو ہسپانیہ کے شاہکاروں کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے" اس کے نظریے میں محبت ایک ایسی بیماری کا نام ہے جو بالغ نوجوانوں کے لیے موزوں ہے، آدمی اس محبت میں پھنس کر "قدرے زرد اور کمزور تو ہوتا ہے لیکن زندگی کے کاروبار کے لیے مستعد بن جاتا ہے"

لیکن" CAMILA " تھیٹر کی زندگی سے اکتا جاتی ہے اور وہ ایک معزز خاتون بننے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ اپنا پیشہ ترک کر دیتی ہے اور اپنے لیے ایک جھیل کے کنارے ایک شاندار بنگلہ تعمیر کروا لیتی ہے (S, VICEROY

اس کا ننھا کزن دربیٹا "JAIME" "جس کا باپ اپنے باپ کی طرح شدت جذبات کا شکار ہے اور اپنی والدہ کی نئی شریفانہ زندگی کے دوران میں نہایت ذلت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ دوسری طرف "PIO" اپنے تمام قسم کے اعلیٰ نصب العین کے باوجود شدید روحانی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ اسے "CAMILA" کی زندگی میں کوئی دخل نہیں رہا۔ اب زندگی اس کے لیے بالکل بے مقصد چیز بن جاتی ہے۔

اچانک "CAMILA" کا حسن چیچک کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہ محبت سے ناآشنائے محض ہے اور صرف ہوس پرستی سے آشنا ہے۔ اس لیے اب وہ سمجھتی ہے کہ زندگی اس کے لیے ختم ہو گئی ہے دہم سے اکثر لوگ جنھوں نے ہوس پرستی کی زندگی بسر کی ہے "محبت کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے جتنا کہ ایک بچہ اپنے پالتو کتے کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ جو اس نے کل ہی کھو دیا ہو" لیکن "PIO" اب تک اس کا وفادار ہے۔ وہ اس سے آخری ملاقات کا موقع پیدا کرتا ہے اور اس سے التجا کرتا ہے کہ وہ اپنے لڑکے "JAIME" کو ایک سال کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دے تاکہ وہ اسے اداکاری کی تربیت دلا سکے۔ وہ انکار کر دیتی ہے تو وہ اسے مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی مقروض ہے وہ جواب دیتی ہے کہ اگر لڑکا رضامند ہے تو اسے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ اگلے دن "PIO" اپنے ساتھ "JAIME" کو لے کر اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے یہ دونوں اس پل پر آتے ہیں تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اس ہلاکت آفریں دو پہر کو ان پانچوں اشخاص کے اتفاقیہ اجتماع میں وہ حادثہ اور ذاتی ہوس کچھ اس طرح در آتے ہیں جیسے اس میں رضائے الٰہی شامل ہو جو ہماری ناقص فہم سے بالا ہو۔ شیکسپیر کے حزنیہ ڈراموں کی طرح جو شخص بچ نکلتے ہیں۔ ان کی دانش میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ راہبہ خیال کرتی ہے کہ اس کے ذہن میں یہ خیال بُری طرح گھر کر گیا تھا کہ اس کے بعد اس کا کام جاری رہے اس لیے جس قسم کی محبت " PEPITA " کو اس سے تھی وہ جواباً اس قسم کی محبت نہ دے سکی۔ اسی طرح " ESTEBAN " بھی اُس قسم کی محبت اپنے بھائی کو نہ دے سکا۔ جس کا اس کی محبت تقاضا کرتی تھی " CAMILA " اب " PIO " کو ہر قیمت پر یقین دلانے کو تیار ہے کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے اور ننھے " JAME " کے ہر دکھ کا مداوا ہر حالت میں کرنے کو تیار ہے۔ یہ سن کر کہ پل کے حادثے میں راہبہ ان دونوں ہستیوں سے محروم ہو گئی ہے جن سے وہ محبت کرتی تھی۔ وہ خود راہبانہ زندگی بسر کرنے کی پیش کش کرتی ہے اور آخرکار خانقاہ میں پہنچ کر بے غرض خدمت کے صلے میں سکونِ قلب حاصل کر لیتی ہے۔ " CLARA " سیاحت کی غرض سے پیرو واپس آتی ہے اور راہبہ سے مل کر اپنی ماں کو حق بجانب ثابت کرتی ہے وہ " PEPITA ESTEBAN " اور " CAMELA " کے حالات سے آگاہ ہوتی ہے۔ راہبہ رقت انگیز لہجے میں کہتی ہے "ہم سب ناکام ہوئے ہیں" تاہم ہر شخص کی اس خواہش کے باوجود کہ وہ کفارہ ادا کریں، ان کے خیال میں انھوں نے "محبت میں جو غلطیاں کی ہیں وہ زیادہ دیر پا نہیں ہیں" آخر میں راہبہ سوچتی ہے کہ "ہم جلد ہی مر جائیں گے اور ان پانچوں کی یاد بھی

فنا ہو جائے گی۔ تاہم انھوں نے ہم سے جس قسم کی محبت کی ہم نے بھی جواباً انھیں وہی خلوص دیا" ایک دنیا زندوں کی ہے اور ایک دنیا مردوں کی۔ ان دونوں دنیاؤں کے درمیان محبت ایک پل ہے اسی کو بقا ہے اور اسی کے کچھ معنی ہیں" "SAN LUIS REY" کے پل سے گزرنے والے پانچوں افراد میں سے ہر ایک پل کے ٹوٹنے کے وقت بذاتِ خود ایک ایسا ہی پل تھا۔

اگرچہ وائلڈر کی گوناگوں قابلیتوں کا مزید ثبوت ۱۹۳۰ء میں ——— "THE WOMAN OF ANDROS" کی اشاعت کے بعد ملا۔ کیونکہ ناولوں میں اس کتاب کی حیثیت ایک ہیرے کی سی ہے اور میری رائے میں اسے مصنف کی بہترین تخلیق کہنا چاہیے۔ تاہم اس کتاب کو قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ ہمارے موجودہ نقطۂ نظر کے اعتبار سے سب سے زیادہ حیران کن امر یہ ہے کہ "MICHAEL GOLD" نے اس پر یہ کہہ کر سخت حملہ کیا کہ یہ ناول نام نہاد "مارکسٹ ادبی تنقید" کا مظہر ہے (جیسے اس قسم کی کوئی چیز قدرتاً وجود میں آ سکتی ہے) یہ حملہ بلاشبہ بدذوقی کی دلیل ہے۔ اُس وقت یہ رواج چل نکلا تھا کہ سستی قسم کی نعرے بازی کر کے امریکہ کے ادبی میدان پر مکمل قبضہ کر لیا جائے۔ یہ حملہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اُن دنوں امریکہ میں ایک عظیم بحران اپنے پورے عروج پر تھا۔ اس لیے بیوقوفوں نے اس قسم کی تنقید سے پورا فائدہ اٹھایا اور انھیں علم و ادب کے میدان میں بے حد کامیابی حاصل ہوئی۔ اُس زمانے میں یہ نعرہ خوب چل نکلا تھا کہ آج کل فن کار بننے کا زمانہ نہیں اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ سب سے زیادہ غلط ایک اور نعرے کو عالمگیر قبولیت حاصل ہو جائے گی۔ وہ بدترین نعرہ یہ تھا کہ اعلیٰ

پراپیگنڈا ہی اعلیٰ فن ہے۔ ادیب کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اس سماجی ناانصافی کے چہرے سے پردہ اٹھا کر اس کی اصلی گھناؤنی صورت کو منظرِ عام پر لے آئے جالیاتی یا فلسفیانہ اقدار کی طرف دھیان دینا اچھا شیوانہ تھا "GOLD" نے وائلڈر پر کچھ اس انداز میں حملہ کیا جیسے "THE WOMAN OF ANDROS" لکھ کر اس نے کوئی بڑا بحران پیدا کر دیا ہو یا اس نے رائج الوقت تجریدی انداز اختیار کر لیا ہو جسے وہ آسانی سے نظر انداز کر سکتا تھا۔ اس طرح جو بحث شروع ہوئی اس سے بہت سے ادیب دو طبقوں میں بٹ گئے۔ جس کی تفصیل میں جانا فضول ہے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان پراپیگنڈے کی غرض سے جو ڈرامے اور ناول لکھے گئے اور جن کو عوام بڑے شوق سے پڑھتے تھے اب خوش قسمتی سے ہم ان کو بھول گئے ہیں۔ ان دنوں کسی ایسے شخص کا عوام کے سامنے جانا جو سماجی شعور سے محروم ہو ایسا ہی تھا، جیسے وہ برسرِ عام ننگا ہو جائے اور معاشرہ اسے قابلِ مقاطعہ قرار دے دے۔ ایسے ماحول میں "THE WOMAN OF ANDROS" کی اشاعت وائلڈر کے زبردست حوصلے کی نشان دہی کرتی ہے "H.S. CANBY" نے جب اس ناول کے بارے میں یہ کہا کہ "THE BRIDGE OF SAN LUIS REY" کے مقابلے میں یہ ناول اگر زیادہ مقبول نہ ہوگا تو اس سے کم پسند نہیں بھی کیا جائے گا" تو اس نے حقیقت پسندی سے کام نہیں لیا تھا۔ ہمارے خیال میں اس کا مطلب یہ تھا کہ "انجام کار یہ ناول مقابلتہً زیادہ کامیاب ثابت ہوگا" "TERENCE" کی تصنیف "ANDRIA" کے پلاٹ کو بنیاد بنا کر لیکن اُسے جزنیہ سمت دے کر وائلڈر نے ایک بار پھر ایسی کتاب لکھی جو اپنی نوعیت

کی پچھلی کتابوں سے یکسر مختلف تھی۔ یہ مختصر ناول یونانی مفہوم میں ہمارے ادب کا کلاسیک ہے اور اس قسم کی پاکیزہ روشنی میں نہایا ہوا ہے جو یونانی ادب کا خاصہ ہے۔ یہ ناول افلاطونیت کی فضا میں پروان چڑھا ہے۔ اس کے مطالعے کے وقت ابتدا سے آخر تک قاری کے ذہن پر سمندر اور صرف سمندر کا احساس طاری رہتا ہے۔

جیسا کہ ایسی کتاب کی خصوصیت ہے اس کا پلاٹ سادہ اور مکمل وحدت کا مظہر ہے۔ اس کا طرز بیان روشن ہے، جس کا سرچشمہ زندگی کے بہت سے حقیقی اور خوشگوار مشاہدات ہیں جو غیر ارادی طور پر اپنے مصنف کی گہری انسان دوستی کا انکشاف کرتے ہیں (اس نے اپنا مذاق اڑایا لیکن اچھے لوگوں کے ہاتھوں بے وقوف بننا کسی کو برا نہیں لگتا)۔ "سب سے زیادہ بے گانہ وہ تعلقات ہیں جو آشنائی کا فریب دیتے ہیں"۔ "ہم سخاوت کے ذریعے جو غلطیاں کرتے ہیں وہ ان منافعوں سے زیادہ خوفناک ہیں جنہیں اتنی احتیاط سے حاصل کیا جاتا ہے"۔ یہ اقتباسات ناول کا اجمالیاتی حسن ہیں۔ اگرچہ ہمارے مشہور ناقد "REX BURBANK" کو اس رائے سے اختلاف ہے کیونکہ وہ انہیں ناخوشگوار حد تک داخلی قرار دیتا ہے۔ تاہم وہ "SOPHOCLES" کے "CHORUSES" سے زیادہ داخلی نہیں یہ کتاب "HEMINGWAY" کے مکتبہ فکر کے غار جیت پسندانہ اسلوب میں ہرگز نہیں لکھی جاسکتی تھی۔ کیونکہ اس صورت میں اس کی تمام خوبی خاک میں مل جاتی۔

وائلڈر اپنے زور بیان کا خوب اظہار کرتا ہے لیکن اسلوب برائے اسلوب

کے نقطۂ نظر سے نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی تحریر بدترین تحریر ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ایسی انشا پردازی کی جولانی دکھاتا ہے جو کہانی کو آگے بڑھاتی ہے۔ درحقیقت یہ ناول ایک ایسے فقرے سے شروع ہوتا ہے جو آفاقیت کے قریب ہے اور یہی ابتدائی فقرہ ساری کتاب کے لہجے کا تعین کرتا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے "زمین اپنے مدار پر آگے بڑھی تو اس نے آہ بھری اور رات کا سایہ سمندر پر رفتہ رفتہ رینگتا ہوا آگے بڑھا اور ایشیا تاریکی میں غائب ہو گیا"

کہانی کا موضوع "جزیرہ "BRYNOS" کی زندگی ہے۔ یہ جزیرہ تمام جزائر میں سب سے کم مشہور ہے۔ ناول کے دو بڑے کردار ہیں۔ پہلا کردار "ANDROS" کے رہنے والی ایک عورت "CHRYSIS" ہے اس کی عمر ۳۵ سال ہے وہ ایک خوبصورت چنال ہے، کلاسیک کی ماہر ہے اور تمام اچھے افلاطون پرستوں کی طرح زمانہ قبل از عیسائیت کی تہذیب کی پرستار ہے۔ دوسرا اہم کردار ایک نوجوان آدمی "PAMPHILUS" کا ہے جو اپنی فطانت کی بدولت جان جاتا ہے کہ عیسائیت بچوں کے بیسے یونانی دنیا کیوں اتنی زرخیز ثابت ہوئی۔

"PAMPHILUS" جو "SIMO" کا بیٹا ہے ایک دولت مند سوداگر ہے جو اپنا اکثر وقت "CHRYSIS" کے ہاں گزارتا ہے۔ جہاں ہفتے میں ایک بار چند درجن کنوارے نوجوانوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ وہ صوفوں پر بیٹھتے ہیں، بدیشی کھانے کھاتے ہیں اور گپیں ہانکتے ہیں۔ وہ انھیں حزنیہ ڈرامے پڑھ کر سناتی ہے اور انھیں ایتھنز والوں کے انداز میں بات کرنا اور دوسرے آداب محفل سکھاتی ہے۔ یہ تمام طور طریقے جزیرہ "BRYNOS" کے اجنبیوں کے لیے نئے ہیں۔ وہ

عورت ایک ایسا لنگرِ خانہ جاری کیے ہوئے ہے۔ جہاں وہ ایسے بوڑھوں اور اپاہجوں کی پرورش کرتی ہے جو اسے ادھر اُدھر آوارہ پھرتے ہوئے مل جاتے ہیں وہ اپنی پُر تکلف دعوتوں میں نئے خیالات پر مباحثوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور اکثر اعلان کرتی ہے کہ نوجوان بہترین فلسفی ہوتے ہیں خواہ ان کا انداز کتنا بھی بھدا ہو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ نہایت جوش و خروش سے نئے خیالات پر لپکتے ہیں۔" ایک دفعہ وہ ایک کہانی بیان کرتی ہے۔ جس کے پلاٹ کو وائلڈر نے اپنی تصنیف " OUR TOWN " میں ایک مقام پر بڑے موثر طریقے سے استعمال کیا) اور بتاتی ہے کہ کس طرح ایک مرے ہوئے ہیرو کو ایک دن کے لیے اس دنیا میں آنے کی اجازت دی گئی۔ شرط یہ رکھی گئی کہ وہ اس کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پُرسکون دن کی طرح بسر کرے۔ وہ ایک مشاعرے میں شریک ہوا۔ چونکہ وہ ایک ایسا فرد تھا جسے حالات کا پہلے سے علم تھا۔ اس لیے اس روز اس نے جو کچھ دیکھا اُس سے اس کا دل دور سے لبریز ہو گیا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ یہ جینے والے بھی اصل میں مردہ ہیں کیونکہ انھیں تیزی سے گزرتی ہوئی زندگی کی کوئی قدر نہیں۔

" PAMPHILUS " اس زاویہ نگاہ سے اردگرد کے لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے "آدمی کس طرح رہتا ہے؟ آدمی کہاں سے زندگی شروع کرتا ہے؟" یہ اس کے لیے بڑے سوال ہیں " CHRYSIS " اپنی تنہائی سے نجات بحث مباحثے میں تلاش کرتی ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو پہلے ہی سے ایک بے جان لاش تصور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے نوجوانوں کے ساتھ خاموشش

محبت کے رشتے کا احساس ہے۔

ایک صبح چٹانوں کے درمیان ٹہلتے ہوئے "PAMPHILUS" کی ملاقات ایک نازک بدن لڑکی سے ہوتی ہے جس کا نام "GLYCERIUM" ہے جو "CHRYSIS" کی بہن ہے۔ جس کو صرف رات کے وقت کھلی فضا میں سیر کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ لڑکی نے اس انتہا کو دیکھنے کے لیے توڑ دیا ہے کہ دن کے وقت سمندر کیسا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کی ایک اور ملاقات ہوتی ہے۔ تیسری ملاقات میں وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

چند ماہ بعد "CHRYSIS" پہلو کے زبردست درد میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اب وہ پورے سکون کے ساتھ موت کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کو ان لوگوں کی فکر ہے جن کو وہ پیچھے چھوڑ رہی ہے۔ سب سے زیادہ اسے "PAMPHILUS" کی فکر ہے جسے جینے والوں کے دکھوں کا بڑا احساس رہتا ہے اور جسے اس احساس سے پیچھا چھڑانے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ دوسروں کی مصیبتوں پر خون جگر کھانا اس دنیا میں نئی چیز ہے "PAMPHILUS" مستقبل کا نقیب ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ جس لڑکی سے وہ محبت کرتا ہے اس سے شادی کرنے کے امکانات کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں، بلبستر مرگ پر لیٹی ہوئی چھنال کے پاس قسم کھانے کے لیے جاتا ہے کہ وہ شادی کا کوئی امکان ہو یا نہ ہو اس کی بہن کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچے گی، لیکن "CHRYSIS" محسوس کرتی ہے کہ ہم پر جو کچھ گزرتی ہے وہ اتنی زیادہ اہم نہیں۔ صرف روحانی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ اُسے زندگی میں درد ملا ہے پھر بھی وہ زندگی کی بے حد مداح ہے وہ اسے

ترغیب دلاتی ہے کہ تم بھی میری طرح پراس چیز کو قبول کرو جو دیتا ہیں عطا کرتے ہیں قطع نظر اس امر کے کہ وہ اچھی ہے یا بُری!

اپنی بہن کی آخری رسوم کے موقع پر "GLYCERIUM" چتا میں جل جانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن اس کا عاشق اسے بچالیتا ہے جو اسے فوراً اپنے بازوؤں میں پکڑلیتا ہے۔ اس کا والد اپنے فرزند کو اس شادی کی ہلاکت آفرینی سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ لڑکی یونان کی رہنے والی نہیں ہے اور وہ اپنے آپ کو جزیرے کی معاشرت میں کبھی نہ ڈھال سکے گی تا ہم باپ کو بیٹے سے بہت زیادہ محبت ہے ایک شام "CHRYSIS" اپنی ساری جائداد فروخت کر دیتی ہے" "SIMO" اس لڑکی کو اس کے خریدار سے مول لے لیتا ہے۔ ان کی شادی ہو جاتی ہے، لیکن وہ لڑکی اور اس کا بچہ پیدائش کے وقت مرجاتے ہیں۔

"PAMPHILUS" کو زندگی میں جس غم اور مسرت کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس میں اسے کچھ پُراسرار معنی نظر آتے ہیں۔ ستارے چپ چاپ زمین پر اپنی نورانی کرنیں پھینک رہے ہیں "جلد ہی انھیں مقدس کہا جائے گا" اور ان میں کون ساستارہ ہے جو اس وقت بھی" اپنے مقدر کا گراں بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہو رہا ہے" اس طرح ناول ختم ہو جاتا ہے۔ "PAMPHILUS" ان معنی کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے جن کی وضاحت یسوع مسیح کو زمانہ قریب ہیں آکر کرنا تھی۔

وائلڈر پر تنقیدی حملے کے دوران میں "GOLD" نے یہ سوال کیا تھا کہ "کیا مسٹر وائلڈر یونانی ہے یا امریکی ؟ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حملے کا

وائلڈر پر کتنا اثر ہوا ہوگا اگرچہ اس کی عادت کے متعلق ہمیں علم ہے۔ اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ اس نے "GOLD" کے مضامین کا مطالعہ ہی نہیں کیا ہوگا تاہم اس کے بعد وائلڈر نے اپنے ناولوں میں امریکی ماحول پیدا کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو بحث طلب ہے نہ قابلِ تاسف کیونکہ وائلڈر کو ہر قسم کے ماحول پر عبور حاصل ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ اتنی تصانیف میں امریکی فضا باندھتا ہے تو آفاقیت کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

"THE LONG CHRISTMAS DINNER AND OTHER PLAYS" جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے ایک ایکٹ کے چھ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں وہ اپنے ابتدائی پسندیدہ اسلوب یعنی ڈرامائی ہیئت کی طرف مراجعت کرتا ہے اس میں تین ڈرامے بذاتِ خود بڑے دلکش ہیں اور تین اس تکنیک کے مطالعے کے لیے اہم ہیں جو اس نے اپنے بعد کے ڈراموں میں استعمال کی۔

"QUEENS OF FRANCE" نہایت پُرلطف فن پارہ ہے ۱۸۶۹ء کا زمانہ ہے۔ اس میں "NEW ORLEANS" کا ایک لاابالی وکیل ایک فاحشہ سرمایہ دار عورت اور ایک معلمہ کی پونجی پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کرنے میں لگا ہوا ہے۔ وہ ان کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ فرانس کے تاج و تخت کی حقیقی وارث ہیں "LOVE AND HOW TO CURE IT" میں ایک نوجوان لندن کے میوزک ہال کی ایک انجمن میں گانے والی سولہ سال کی ایک لڑکی سے دیوانہ وار محبت کرتا ہے۔ لیکن ٹھکرائے جانے پر خودکشی کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسے ایک طربیہ کا ماہر

بوڑھا کردار اس اقدام سے روکتا ہے۔ وہ اپنی آنجہانی بیوی کا ذکر نہایت محبت بھرے لہجے میں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میری بیوی کو مجھ سے اتنا زیادہ پیار تھا کہ اس نے مجھ سے اپنی مہلک بیماری کا ذکر تک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ "THE BRIDGE" کی "MARQUESA" کی طرح یہ نوجوان محسوس کرتا ہے کہ سچی محبت بے غرض ہوتی ہے اور وہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو آئندہ دق نہیں کرے گا۔

"SUCH THINGS HAPPEN ONLY IN BOOKS" میں ایک ناول نگار اور اسکی بیوی "NEW HAMPSHIRE" کے گاؤں میں ایک پرانے مکان میں رہتے تھے۔ ناول نگار شکایت کرتا ہے کہ زندگی کبھی حقیقی پلاٹ مہیا نہیں کرتی۔ ایسے واقعات صرف کتابوں میں پائے جاتے ہیں کہ باورچی اجنبیوں کو باورچی خانے میں بلا کر چوری چھپے کھانا کھلاتے ہیں۔ بیویاں نوجوانوں سے محبت کرتی ہیں۔ قاتل جرم کے مقام پر ضرور واپس لوٹ کر آتے ہیں جیسے جیسے یہ ڈرامہ آگے بڑھتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے تمام واقعات ناول نگار کے اپنے ہی گھر میں رونما ہو رہے ہیں اور اسے خبر تک نہیں۔

"THE LONG CHRISTMAS DINNER" میں اس کے بعد لکھے جانے والے بڑے ڈرامے "OUR TOWN" کی طرح زندگی اور موت کے معجزوں اور انسانی تجربے کے لافانی ہونے کا ذکر ہے۔ ایک امریکی خاندان بلا ناغہ نسل در نسل کرسمس کے موقع پر ضیافت کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ واقعہ بیان کر کے اس خیال کو تقویت پہنچانا مقصود ہے کہ جس چیز کو زندگی میں بنیادی حیثیت حاصل ہو وہ کبھی تبدیل نہیں ہوتی بہت کم کرداروں کو منفرد بنایا گیا ہے۔ لڑکیاں اور

لڑکے، مائیں اور باپ بن جاتے ہیں اور جلد ہی مرجاتے ہیں۔ صرف ایک لڑکی بڑھ کر بالغ خاتون بنتی ہے اور ایک لڑکا بڑھ کر بائی بنتا ہے وہ موجود نظامِ زندگی سے اس قدر دور کھڑے ہیں جتنا کہ دوسرے لوگ اس سے چمٹے ہوئے ہیں یہ ناول لہجے اور تکنیک میں " OUR TOWN " کا ایک قسم کا ابتدائیہ ہے۔ ڈرامہ نگار نے پیدائشوں، موتوں اور وقت کو اپنی مرضی کے مطابق گویا دوربین سے دیکھا ہے۔ اس ڈرامے میں کردار کو مناسب وقت پروں والی سفید ٹوپی پہنا کر اس کے بڑھاپے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آفرینش اور موت کے ساتھ جسمانی کرب کی جھلک نہیں دکھائی گئی۔ یہ چیزیں ایک نیچری ادیب کی توجہ کا مرکز ہو سکتی ہیں نوزائیدہ بچوں کو دایا بڑی سادگی سے گاڑی میں ڈال کر لے آتی ہے اور مائیں یوں حیران اور خوش دکھائی ہیں گویا ان نوزائیدہ بچوں کو سارس اپنی چونچ میں پکڑ کر اٹھا لایا ہے۔

جب کوئی کردار قریب مرگ ہوتا ہے تو اسے محض رفتہ رفتہ موت کے دروازے کی طرف چلنا پڑتا ہے "غم انگیز چیزیں مظلوم چیزوں کی مانند نہیں ہوتیں"۔ موت ہلکا سا غم لاتی ہے لیکن مصیبت کا باعث نہیں بنتی اور اس میں ایک طرح کی خوشگوار مٹھاس ہوتی ہے اگر دل پر چھری چلتی ہے تو وہ کسی کی موت کے بعد دہرائے جانے والے جملے کی صورت میں وارد ہوتی ہے "میں نے اس عورت کو کبھی نہیں بتایا کہ وہ کتنی عجیب وغریب تھی" یہ جذبہ بعد میں " OUR TOWN " میں ڈرامائی انداز میں بھی ظاہر ہوگا اور یہ جذبہ پہلے " CLARA " کے " MARQUESA " سے تعلقات میں بھی پوشیدہ تھا۔

"OUR TOWN" ایک ایسی تصنیف ہے جو "PULLMAN CAR HIAWATHA" کی طرف ایک مزید قدم ہے۔ اس میں واحد منظر سٹیج کے پرلی طرف ایک ادنچا زینہ اور دو ویٹر جہاں ہیں جو اس سے نیچے اُترتی ہیں۔ یہاں بعد کے ڈرامے کی پیشگی جھلک کے طور پر ایک سٹیج مینجر ملتا ہے جو ہر قسم کے کام کرتا ہے۔ ڈرامے کے گیت گاتا ہے اور ادنیٰ کرداروں کے فقرے بولتا ہے۔ یہ سٹیج مینجر ہمیں بتاتا ہے کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کے روز "PULLMAN CAR HIAWATHA" کار میں نیویارک سے شکاگو کی طرف جارہا ہے جب وہ کرداروں کو پکار کر بلاتا ہے کہ سب لوگ ادھر آجائیں تو وہ کرسیاں اٹھائے ہوئے آتے ہیں یہ کرسیاں جہاز میں سونے کے کمرے کی علامت ہیں۔ ہم بہت سے مسافروں کی گفتگو سنتے ہیں اور ان کے ذاتی خیالات کو پس پشت کھڑے ہو کر سنتے ہیں۔ ہم بعض بے جان چیزوں کی تقریریں بھی سنتے ہیں مثلاً ریاست اوہائیو کا وسیع میدان "GROVER'S CORNERS" اور ایک شہر "PARKERSBURG" اور مختلف ساعتیں اپنی اپنی کہانی سناتی ہیں اور ہر ایک کو اپنے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے۔ ایک دیہاتی الگ گاڑی کے ساتھ پیدل سفر کرتا ہوا رونما ہوتا ہے اور اپنی بات سنانے کا حق طلب کرتا ہے۔ ڈرامے میں جو واحد واقعہ بیان کیا گیا ہے بیمار "HARRIET" کی موت کا سانحہ ہے جو اس سے قبل کہ ڈاکٹر کو بلایا جائے مر جاتی ہے جو فرشتہ اسے لینے آیا ہے وہ اس کے ساتھ جانے میں جھجک محسوس کرتی ہے (میں نے تو کبھی زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا) اور وہ چاہتی ہے کہ اسے طویل عرصے تک اس کی خامیوں کی سزا دی جائے۔ اس کی سب

سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ نئی زندگی شروع کرے۔ یہ خیال "OUR TOWN" کے آخری ایکٹ میں دُہرایا جائے گا) وہ اپنی زندگی کا جائزہ لیتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو اس کے شوہر کی محبت نے کچھ معنی عطا کیے تھے۔ یہ "THE BRIODGE OF SAN LUIS REY" کا اختتامی خیال ہے (چونکہ وہ ہر چیز کو سمجھتی ہے۔ اس لیے اس کی موت اس کی زندگی کی تکمیل ہے (براؤننگ نے بھی اسی خیال کو "PROSPICE" میں پیش کیا تھا) وقت کو دوبارہ دوربین کی مدد سے قریب لاکر دکھایا گیا ہے اور گارٹی شکاگو پہنچ جاتی ہے۔

"THE HAPPY JOURNEY TO TERNTON AND CAMDEN" اداکاری کے تبدیلیوں کو بہت زیادہ پسند رہا ہے۔ یہ تکنیک کے اعتبار سے "OUR TOWN" کے قریب ہے۔ ایک خاوند، بیوی، لڑکا اور بیٹی اپنے گھر واقع "NEWARK" سے "CAMDEN" (نیوجرسی) میں اپنی شادی شدہ لڑکی سے ملنے جاتے ہیں سٹیج کے سامان کی عدم موجودگی ڈرامہ نگار کو متحرک تصویر کی سی سبک رفتاری کے قابل بناتی ہے۔ یہ خاندان پہلے اپنے گھر میں ہوتا ہے پھر اپنے ہمسایوں سے رخصت ہوتا ہے اس کے بعد موٹر گاڑی میں سوار ہوتا ہے "CAMDEN" تک سفر کرتا ہے۔ وہاں پہنچنے پر اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ چار کرسیاں کار کی چار نشستوں کا کام دیتی ہیں۔ سٹیج منیجر کرسیوں کو ترتیب دیتا ہے اور بہت سے ادنیٰ اداکاروں کے مکالمے بھی بولتا ہے۔ باقی تمام چیزیں مثلاً کار کے سٹیرنگ وغیرہ کا پہروپ ایکٹر بھرتے ہیں۔ سفر کے دوران میں ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرتا ہے۔ ماں آہ بھرتی ہے کیونکہ اسے اپنا بیٹا یاد

آجاتا ہے جو لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اس چھوٹے سے ڈرامے میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے پلاٹ کہا جا سکے۔ تاہم اپنی انسان دوستی کی قدر کی وجہ سے بہت اچھا ڈرامہ ہے جسے سٹیج پر دکھایا جا سکتا ہے۔

"THE WOMAN OF ANDROS" وائلڈر کی بہترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ اس کے باوجود لوگوں نے اس کی سب سے کم قدر کی ہے۔ اس کی تصنیف "HEAVEN'S MY DESTINATION" ۱۹۳۵ء کو بہت زیادہ غلط سمجھا گیا ہے۔ اس ناول کے ہیرو "JEORGE BRUSH" کا جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس سے زیادہ غلط شاید ہی کوئی اور چیز ہو۔ اسے ایک ناقد نے اپنے ایک فقرے میں سمو دیا ہے "ایک باتونی، ایک مذہب زدہ جنونی اور ناپاک مریض۔" "HARRY HANSEN" کا خیال تھا کہ وائلڈر بذات خود اتنا بدقسمت نہیں کہ اس کی ملاقات سچ مچ کسی "JEORGE BRUSH" سے ہوتا ہم "MISS TSABEL WILDER" نے میرے خیال کی تصدیق کی ہے کہ اس کے بھائی نے اپنے ہیرو کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں اس کی اپنی سوانح عمری کا کافی عنصر موجود ہے۔

"SINCLAIR LEWIS" سب سے پہلا شخص ہے جو اپنے ہم وطنوں سے شدید نفرت کرتا ہے اور ان کو تاہیوں کا بڑی سختی سے محاسبہ کرتا ہے۔ وائلڈر اپنے امریکی ہم وطنوں سے محبت کرتا ہے، لیکن ان کی خامیوں کی طرف آنکھ بند کیے بغیر بڑی فراخ دلی سے ان کی طرف دیکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن سے ہمیں پیار ہوتا ہے۔ مزید بریں وائلڈر کے مقاصد اور اسالیب

ایسے نہیں جنہیں "LEWIS" نے خام اور ناجائز طنز کا نشانہ بنائے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ "LEWIS" امریکی ادب کا جرنیل بن کر سامنے آئے اور ہمارے ثقافتی خلا کو پُر کرنے کے لیے حملہ آور ہو۔ اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ ثقافتی خلا کھلے حملوں سے پُر نہیں کیے جا سکتے۔ غور سے دیکھا جائے تو خود "LEWIS" کی ذات میں جنون کچھ کم مقدار میں شامل نہیں۔ ہمیں وہ بار بار یہ احساس دلاتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ادیب اور فن کار کامیاب سرمایہ کاروں کی "CADILLACS" کاریں چلانے کے بھی قابل نہیں، لیکن وائلڈر کے بارے میں اس کا خیال بالکل غلط ہے کیوں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا مہذب اور تربیت یافتہ ذہن رکھتا ہے۔

جیسا کہ "J.H. RALEIGH" کا خیال ہے "JEORGE BRUSH" "ایک جدید "QUIXOTE" (ایک ہسپانوی مزاحیہ افسانوی کردار ہے) اس آدمی کے دل و دماغ نہائت شریفانہ اور اعلیٰ مقاصد سے پُر ہیں۔ وہ دوسروں کی مدد کرتا ہے اور اپنی اخلاقی خودی کو برقرار رکھنے کی مخلصانہ خواہش کی وجہ سے اسے ہر جگہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک حد تک اس کے تجربات اس حقیقت کی تشریح کرتے ہیں کہ دنیا کے لوگ بے غرض انسان کو اس کی نیکی کے بدلے ایذا پہنچانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تاہم نیک سیرت افراد کا ایمان اپنے تجربات کی کٹھالی میں ڈھل کر اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے خواہ ایک معصوم فرد کو کتنی بھی سزائیں بھگتنا پڑیں۔ اور اسی قسم کی معصومیت وائلڈر کی اپنی شخصیت کا ایک پہلو ہے لیکن یہ کتاب بھی "CERVANTES" کی کتاب کی طرح ایک بہت بڑا طربیہ ڈرامہ

ہے اور وائلڈر "BRUSH" کے دشمنوں کو بجا طور پر دکھانا ہے کہ اس کا ہیرو اتنا زیادہ معصوم ہے کہ وہ مجاہد نہیں بن سکتا۔ وہ بہترین اصولوں اور مضحکہ خیز ذاتی پابندیوں کا ایک عجیب و غریب مرقع ہے۔ ایک ایسے عہد میں جبکہ ہر ایک قابل احترام مذہبی رہنما خواہ وہ کیتھولک ہے، خواہ پروٹسٹنٹ یا یہودی اس تحقیق کو قبول کر چکا ہے کہ انجیل کو کئی صدیوں کے دوران میں بہت سے ہاتھوں نے تحریر کیا ہے اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ابتدائی اور آخری عہد کی تحریفات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا جائے "BRUSH" انجیل کی بنیادی تشریحات پر زور دیتا ہے۔ وہ عورتوں کی تمباکو نوشی کو بداخلاقی کی انتہا تصور کرتا ہے، لیکن ایک ایسے نیک دل آدمی میں اس قسم کی تنگ نظری اتنی ہی قابلِ رحم ہے جتنی کہ وہ مضحکہ خیز ہے۔ اپنے قدامت پسندانہ نظریات کے باعث اس کو دلی مسرت حاصل نہیں ہوتی لیکن اس کے نظریات سے دنیا کی مخالفت کی وجہ اس کی تنگ نظری نہیں ہے بلکہ اس کی انتہائی بے غرضی ہے۔ انجیل اور گاندھی سے متاثر ہو کر اس نے رضاکارانہ طور پر افلاس کی زندگی بسر کرنے کی قسم کھائی اور اسے بعد کی زندگی میں روپے پیسے کے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ رہی جیسے اسے اپنی محرومی کا کوئی احساس ہی نہ ہو۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی منطقی کوشش کرتا ہے اور یہی حقیقت اس کی سب سے بڑی مصیبت ہے لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ سچ مچ کبھی مصیبت میں مبتلا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے تجربات کے باوجود جو کسی دوسرے شخص کی تباہی کا باعث بن سکتے ہیں" "JEORGE BRUSH

کو اپنے آپ سے کوئی ہمدردی نہیں اس کے نزدیک ہر قسم کی علالت محض حوصلہ شکنی کی پیداوار ہے اور اس کے ساتھ خواہ کچھ بھی بیت جائے وہ ایک لمحے سے زیادہ کبھی پست ہمت نہیں ہوا۔

اگر وہ اپنی نیک طبیعت کی بنا پر سادہ دل ہے تو دوسری طرف گوناگوں قوتوں کا مظہر بھی ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے بڑا تنومند اور بڑی اچھی صحت کا مالک ہے۔ اس کے باوجود اس میں ایک صوفی جیسی انکساری ہے جس کا اسے کوئی شعور نہیں ہے جس قسم کے بحران کے زمانے میں یہ نوجوان زندہ ہے۔ اس میں ایک صوفی جیسی انکساری ہے جس کا اسے کوئی شعور نہیں ہے۔ صوفیوں پر بندی نہایت حیران کن بات ہے۔ وہ کہتا ہے "میرے خیال میں بحران کا اثر ہر شخص پر مساوی ہونا چاہیے۔ وہ کتابوں کا کامیاب بیلز مین ہے وہ صرف اس وقت پریشان ہوتا ہے۔ جب اس کے پاس اتنا روپیہ جمع ہو جاتا ہے جو اس کی عام ضرورتوں سے فالتو ہو۔ اسے سود سے نفرت ہے اور بغیر ارادی طور پر وہ ایک بنک کی تباہی کا باعث بنتا ہے کیونکہ وہ ایک چھوٹا کھاتہ کھولنے کے بعد اس سے زیادہ رقم وصول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جتنی کہ اس نے جمع کرائی تھی۔ وہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے میں کبھی تھکن محسوس نہیں کرتا اور مدد کرتے وقت یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی مصیبت زدہ شخص بداخلاقی کے کس قدر گہرے گڑھے میں گرا ہوا ہے اور عام طور سے اس کا مقدر یہ ہے کہ وہ لوگوں کی مدد کر کے نفرت ہی مول لیتا ہے۔ اس کی نیک چلنی اس کے ہم جولیوں کی ناراضی کا باعث بنتی

ہے اور بعض لوگ یہاں تک مشتعل ہو جاتے ہیں کہ اسے تباہ کرنے کے لیے سازشیں کرنے لگتے ہیں لیکن اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ خواہ اسے بے خبری میں شراب پلا دی جائے، خواہ اسے قحبہ خانے میں لے جائیں۔ یا اسے جیل میں پھینک دیا جائے۔ اس کی ذاتی ایمانداری اور نیک نیتی اسے تباہی اور گمراہی سے بچا لیتی ہے اور اس کے بدخواہ اس کی پاک نیتی کے مقابلے میں پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور حیران و پریشان رہ جاتے ہیں۔ اس انتہائی دلچسپ ناول کے ہیرو کے متعلق بنیادی بات اس کی لاعلمی یا معصومیت سے جنم لینے والی حماقتیں نہیں بلکہ ایک ایسی دنیا میں جہاں نیکی پر بدی غالب ہے، اس نیک سیرت شخص کا دلیری سے نیکی کی راہ پر گامزن رہنے کا عزم مصمم ہے۔ یہ تصویر "THE WOMAN OF ANDROS" کے ایک مقولے کی تشریح ہے۔ اور وہ مقولہ یہ ہے "تمام اقسام کے عالی طبع افراد میں نیک چلن شخص کی زندگی سب سے زیادہ بے ڈھب ہوتی ہے"۔ یہ ناول ایک ایسا طربیہ ہے۔ جس کا موضوع ایسے ہی عالی طبع شخص کے ابتدائی حالات ہیں۔

اس ناول کے جس پہلو کی طرف توجہ نہیں دی گئی وہ یہ ہے کہ کتاب میں جو کردار اخلاقی اعتبار سے اتنے گر چکے ہیں کہ ان کی اصلاح کا کوئی امکان نہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو مہذب دنیا میں ہر کہیں ملتے ہیں۔ لیکن یہ نیک آدمی بالخصوص اس کردار کے زیادہ قریب ہیں۔ جو صرف امریکن ہو سکتا ہے۔ اس شخص کی معصومیت کا وجود ہمارے معاشرے سے باہر تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

آسکتا۔

یہ حقیقت بڑی دلچسپ ہے کہ وائلڈر نے "GEORGE BRUSH" کا کردار اس کی فکر پر "GERTRUDE STEIN" کے اثر انداز ہونے سے بہت پہلے تخلیق کر لیا تھا۔ "HEAVEN'S MY DESTINATION" کی اشاعت کے بعد "STEIN" سے گفتگو کے دوران میں تسلیم کرتا ہے کہ وہ اس کے اس عقیدے سے متاثر ہوا تھا کہ امریکیوں کی روزمرّہ کی زندگیوں میں جنھوں نے اپنے مقدر کو دنیا کی قسمت سے وابستہ کر لیا ہے، آفاقی اور ابدی عناصر پائے جاتے ہیں۔ کم از کم "OUR TOWN" کی اشاعت کے وقت وائلڈر کا اپنا عقیدہ کچھ اسی قسم کا تھا۔

وائلڈر کو آفاقی اور لافانی اقدار کی تلاش ہی دوبارہ تھیٹر کی طرف لے آئی۔ وہ خود لکھتا ہے کہ "ناول بنیادی طور پر خصوصی واقعات کے اظہار کا ذریعہ ہے اور تھیٹر عمومی واقعات کے اظہار کا" تھیٹر اپنے عروج کے زمانے میں ہمیشہ مہذب مذہبی اصوات کا نمائندہ رہا ہے "تھیٹر کی اس قوت کے ذریعے ہی جو زبرِ نالش انفرادی عمل کو خیالی، مثالی اور آفاقی حدود تک بلند کر دیتا ہے، ہمارا عقیدہ بیدار اور استوار ہوتا ہے" اسی وجہ سے اپنے ابتدائی تجربات کی طرح یہاں بھی وائلڈر ساز و سامان اور مناظر کو خیرباد کہہ دیتا ہے "جب آپ تھیٹر میں مکان پر زور دیتے ہیں تو آپ زمان کو سمیٹ کر محدود کر دیتے ہیں" اس التزام کو درست ثابت کرنے کے لیے اس امر کی طرف توجہ مبذول کرا دینا کافی ہے کہ "SHAKESPEARE" "SOPHOCLES, AESCHYLUS" اور "RACINE" کے تھیٹر اور ڈرامے تمام

سے کس قدر آزاد تھے۔ ہمارا ڈرامہ نگار اپنے مقصد کو بالکل وضاحت سے بیان کر دیتا ہے "NEW HAMPSHIRE" کو "OUR TOWN" کے ایک گاؤں کی زندگی کی تصویر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا۔۔۔۔۔ یہ ہماری زندگی کے روزمرہ کے ادنیٰ واقعات میں اعلیٰ قدر کی تلاش کی ایک کوشش کے تجزیے بہاہے۔ میں نے اس دعوے کو حتی الامکان بے معنی بنا دیا ہے کیونکہ میں نے زمان و مکان کی وسیع ترین پیمائشوں کے پس منظر میں گاؤں کو دکھایا ہے۔ اس کھیل میں جو لفظ بار بار آتے ہیں وہ ہیں "سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں"۔

یہ ڈرامہ روزمرہ کی زندگی اور اس کے امکانات کا مقدس گیت ہے۔ اس کے آخری ایکٹ میں اسی خیال کو پورے ڈرامائی انداز سے بیان کیا گیا ہے جس کو "THE WOMAN OF ANDROS" میں ایک کہانی کی صورت دی گئی ہے۔ "EMILY" کی وفات حال ہی میں ہوئی ہے۔ اس کو اپنی زندگی کا کوئی اہم دن دوبارہ بسر کرنے کی اجازت مل جاتی ہے اور وہ دوبارہ جینے کے لیے اپنا بارھواں جنم دن انتخاب کرتی ہے۔ جیسے جیسے دن گزرتا جاتا ہے اس کی تشویش بڑھتی جاتی ہے اور وہ چلاتی ہے کہ ہمارے لیے اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔۔۔۔۔ میں نہیں پہچانتی۔۔۔۔ آہ اے زمین تم اتنی حیرت انگیز ہو کہ کوئی آدمی تجھے پہچان نہیں سکتا"۔ ایک کردار جسے مرے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے یوں نکتہ چینی کرتا ہے "اب تمہیں پتہ چلا کہ زندگی کے کہتے ہیں اور کتنی حماقت ہے۔ وقت کو اس طرح صرف و ضائع کرنا جیسے ہماری عمر لاکھوں برس کی ہو اور ہم کبھی تو ایک خود غرضانہ خواہش کے رحم و کرم پر ہوں اور کبھی کسی

دوسری کے "لیکن وائلڈر کے ارادے میں کوئی تلخی نہیں ہے۔ سٹیج مینجر جو اپنی آفاقی بصیرت اور ہمدردی میں دیوتاؤں کی سی حیثیت رکھتا ہے محض شخصی مقصد سے بہت بلند ہے "ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی چیز ابدی ضرور ہے" اور جو چیز ابدی ہے "اسے مقام، نام، زمین یا ستاروں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس ابدی چیز کا تعلق صرف انسانوں سے ہے۔ پانچ ہزار سال تک دنیا کے بڑے بڑے مفکر "ہمیں یہ بتاتے آئے ہیں" اور ابھی تک ہمیں بتا رہے ہیں پھر بھی لوگ اس چیز پر قدرت حاصل کرنے سے قاصر رہے ہیں" آخری ایکٹ کے مین خاتمے پر سٹیج مینجر ہمارے ستارے زمین کے متعلق کہتا ہے کہ "یہ ہر وقت اپنے آپ کو کچھ بنانے کے لیے تگ و دو کرتی رہتی ہے۔ یہ تگ و دو اتنی سخت ہے کہ ہر سولہ گھنٹے کے بعد ہر شخص تھک کر لیٹ جاتا ہے اور آرام کرنے لگتا ہے"

سارے ڈرامے میں یہی لہجہ جاری و ساری ہے۔ یہ ڈرامہ یک گونہ جادو کے زیر اثر ایک ایسی فضا میں آگے بڑھتا ہے جو نہایت سیدھی سادی اور بعض تعلقات پر بلا تکلف ارفع و پاکیزہ ہے۔ جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ عام شہریوں کے باہمی میل جول اور مصروفیات کے پس منظر میں ایک لڑکے اور لڑکی کو آپس میں محبت ہو جاتی ہے وہ منگنی کر لیتے ہیں اور بعد میں شادی کر لیتے ہیں وہ لڑکی بیوی بنتی اور لڑکے کی پیدائش کے وقت مر جاتی ہے یہ ہے وہ مواد جسے ہم چاہیں تو کہانی کہہ لیں۔ تاہم ڈرامہ نگار نے جان بوجھ کر جو عام واقعات منتخب کیے ہیں وہ ادنیٰ قسم کے نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ان میں نہایت لطیف شاعری ہے اور یوں لگتا ہے کہ ان پر ابدیت عکس ریز

ہے۔ تمام شہ کاروں کی طرح یہ خوبصورت تصنیف بھی کسی تحلیل و تجزیے کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی آفاقیت کا جزوی راز یہ ہے کہ وہ محدود سٹیج کے تکلفات سے بری ہے۔ اور جزوی راز اس کی سبک و رواں تحریر ہے۔ یہ سبک رفتاری پہلے یک بابی ڈرامے کی طرح ایک سٹیج منیجر کے ذریعے پیدا کی گئی ہے جو بیک وقت گویا، صاحب حال و اسباب اور ایک ایسا ایکٹر ہے جو تمام چھوٹے چھوٹے رول اپنے ذمے لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ تاہم یہ سب صرف تکنیک کی باتیں ہیں اس سے بھی زیادہ شاطرانہ طریقہ یہ ہے کہ وائلڈر جان بوجھ کر وقت یا زمانے کے متعلق ابہام پیدا کرتا ہے اور مختلف مناظر کو اس طرح تشکیل دیتا ہے کہ انھیں آسانی اور آزادی سے چند سال پہلے یا مابعد کے چند برسوں سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرز کے اس واحد ڈرامے کی سحر انگیزی کو جزوی طور پر ماحول اور کرداروں کے مابین ظاہری تناقض سے بھی منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس کے کردار انتہائی طور پر سادہ لوح ہیں "NEW ENGLAND" کے اس گاؤں میں جہاں تک "کسی ثقافت یا حسن کی محبت" کا تعلق ہے "یہ دونوں چیزیں کچھ زیادہ نہیں پائی جاتیں اور سٹیج منیجر تسلیم کرتا ہے کہ اس شہر کا کلچر کا زیادہ سے زیادہ رابنس کروسو یا انجیل یا" HANDEL "کی تصنیف" "LARGO" اور " WHISTLER " کی تصنیف "MOTHER" میں بیان شدہ ثقافت تک محدود ہے لیکن " THE CABALA " کے بعد سے اب تک وائلڈر نے کلچر کے میدان میں بڑا طویل فاصلہ طے کیا ہے شیلی کی طرح کام کرنے والے انھی لوگوں کی معرفت ڈرامہ نگار کی انسانیت پرستی اس چیز کو بحال کرتی ہے۔

جس سے ان کا غرور و نخوت اور ہاؤ ہو ہمیں محروم رکھتا ہے اور وہ چیز ہے۔ زندگی کی پُراسراریت اور مسحور کن تقدس۔

یہ ڈرامہ جسے آئندہ ہم "THE MATCHMAKER" کہیں گے "THE MERCHANT OF YONKERS" مطبوعہ ۱۹۳۸ء کی صرف جزواً تبدیل شدہ صورت ہے جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ اس فارس میں اُنیسویں صدی کے تھیٹر کے طور طریقوں کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔ تاکہ اس کی اصلاح کے لیے کوشش کی جائے اگرچہ یہ کھیل ایک حد تک ایک قدیم انگریزی ڈرامے کا چربہ ہے جسے وہ آج کے ماحول میں ڈھالا گیا ہے۔ تاہم اس کے بنیادی تصورات وائلڈر کے اپنے ہیں "نوجوانوں کی امنگیں (اور صرف نوجوانوں ہی کی نہیں) ایک زیادہ بھرپور اور زیادہ آزاد زندگی کے لیے سب انسانوں کی آرزوئیں" اس کا بنیادی تصور ہے۔

اس کا پلاٹ رشتے ناطے کرنے والی عورت "DOLLY LEVI" کی شاطرانہ چال کے گرد گھومتا ہے۔ وہ "YONKERS" کے ایک سوداگر "HORACE VANDERGELDER" کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی شادی ایک حسین، دولت مند، جوان، یتیم دوشیزہ سے کرا دے گی لیکن یہ دوشیزہ اس کے تخیل کی پیداوار ہے۔ اصل میں وہ اس سوداگر سے خود شادی کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہی تھی۔ یہ واقعہ ۱۸۸۰ء کے آغاز کا ہے جسے ہنسی سے پاگل بنا دینے والے فارس ڈرامے کی صورت دی گئی ہے۔ اس میں مزاحیہ ڈرامے کی صدیوں پرانی روایتی ترکیبوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً چور دروازے سے آنا جانا، میزوں کے نیچے اور الماریوں میں چھپ جانا اور اپنی ٹوپی کو اپنے وجود کی گواہی دینے

کے لیے باہر چھوڑ جانا، پردے کے پیچھے چھپ کر دوسروں کی باتیں سننا، عورتوں کا لباس پہن کر گرفتاری سے بچ نکلنا، کسی شخص پر دوسرے کا شبہ ہونا وغیرہ۔ یہ ڈرامہ تیز رفتار ہے اور اس کی ہر سطر نہایت دلفریب ہے۔ لیکن وائلڈر کا کمال یہ ہے کہ ایک فارس میں بھی جس کا مطلب صرف ایک شام کی تفریح سے زیادہ کچھ نہیں، اُس نے بہت سی معنی خیز باتیں کردی ہیں " VANDERGELDER "صرف روپیہ جمع کرنے کی خاطر زندہ ہے " DOLLY "اس کو اس کے برعکس سبق پڑھاتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے "روپیہ بارش کے پانی کی طرح گردش میں رہنا چاہیے" وہ تو اس خیال کے تصور سے بھی گھبراتی ہے کہ اس کا روپیہ بے کار پڑا ہے یا زمین میں گڑا ہے، لیکن " VANDERGELDER " کو ان لوگوں سے نفرت ہے۔ جو دولت اکٹھی کرنے کے لیے دوسروں کو استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا بے وقوفوں سے بھری ہوئی ہے۔ شاید اس کا خیال ٹھیک ہی ہے " DOLLY "کہتی ہے "تاہم ہر شخص کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ بہت سے احمقوں میں ایک احمق کی طرح جیئے گا یا صرف ایک تنہا احمق کی طرح" وہ خود انسانوں میں رہنے کا فیصلہ کرتی ہے اور بے خطر زندگی گزارنے کے مقابلے میں ضرورت کے وقت خطرہ مول لینے کو ترجیح دیتی ہے۔ "ہم جیسے احمقوں کو نقصان کی زد سے باہر رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہمیں وہ محدودے چند انسانی خوشیاں عطا کر دی جائیں جن پر ہمارا حق ہے" اور اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے تاہم کچھ زیادہ روپے کی ضرورت بھی نہیں۔ افلاس اور کم مایہ ہونے میں بڑا فرق ہے" اور یہ فرق دنیا کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔" روپے کی تھوڑی مقدار

اور بے شمار دولت کے درمیان "نہائت ہلکا فرق ہے — اور یہ امر بھی دنیا کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔" روپیہ کھاد کی مانند ہے کیونکہ یہ بھی اس وقت تک بیج ہے "جب تک اسے دوسری چیزوں کی نشوونما کے لیے چاروں طرف چھڑک نہ دیا جائے۔" اور اسی کام کو "DOLLY" اپنا خاص مشغلہ تصور کرتی ہے وہ اپنے مخصوص انداز میں ایک فن کارہ ہے۔ اس لیے زندگی کی موجودہ صورت سے مطمئن نہیں ہے اور منزوری سمجھتی ہے کہ زندگی کو یہاں وہاں سے تھوڑا بہت بدل دیا جائے۔ لیکن اس کی چال کی کامیابی سے قبل ہر شخص اس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں "THE SKIN OF OUR TEETH" شائع ہوا۔ تنقید نگاروں نے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا لیکن تھوڑے عرصے بعد یہ بھی وائلڈر کی ادبی زندگی کا دوسرا بڑا متنازع فیہ ڈرامہ بن گیا جبکہ "JOSEPH CAMPBELL" اور "H.M. ROBINSON" نے اس کے مصنف پر "FINNEGANS WAKE" کی چوری کا الزام لگایا۔ ڈرامہ نگار نے اب اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ اس کا ڈرامہ جوائس "JOYCE" کا "احسان مند ہے" لیکن یہ الزام اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا کہ بیس پچیس سال پہلے "MICHAEL GOLD" کا فضول اعتراض تھا۔ البتہ اس بار دوامی پائے کے عالموں نے الزام تراشی کی تھی۔

یہ حقیقت کہ وائلڈر کو جوائس سے مکمل واقفیت تھی اس مقالے سے پوری طرح منکشف ہے جو اس نے جوائس پر لکھا اور ایک سال بیشتر ۱۹۶۱ء میں POETRY میں شائع ہوا۔ اس میں وہ "FINNEGANS WAKE" کی تلخیص ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے "جو نیند کی زبان" "SLEEP LANGUAGE" میں ہے جس میں سونے والا دوبارہ زندہ ہو کر "رات بھر ادلین گناہ کے مسئلے سے کشتی لڑتا ہوا، بنی نوع انسان کی گذشتہ تاریخی زندگی کو دوبارہ بسر کرتا ہے"۔ وائلڈر نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہم اس کتاب کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد شاید جوائس سے متفق ہو جائیں کہ "یہ اس کی بہترین تصنیف ہے"۔

کیا ہم "JOYCE" کی تصنیف سے بخوبی آگاہ ہو گئے ہیں اور اس سے بھی اہم یہ کہ کیا ہم اسے کبھی سمجھ بھی جائیں گے؟ "JOYCE" کی آخری تصنیف پر آخری تجزیہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ یہ تو وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ آیا۔ اس اسلوب میں لکھی ہوئی کتاب سچ مچ ایک عظیم کتاب ہو سکتی ہے یا مصنف کی ناموری کی بڑھی ہوئی خواہش کے باوجود وہ صرف ایک ادبی اچوبہ ہے۔ بہر صورت وائلڈر پر کتاب کی چوری کا الزام لگانا اتنی ہی ناسمجھی ہے جتنا کہ "SOPHOCLES" کی تصنیف "ELECTRA" پر "AESCHYLUS" کی چوری کا الزام لگانا یا "EURIPIDIES" پر ان دونوں مصنفوں کی چوری کا الزام لگانا یا "RACINE" کی تصنیف "PHEDRE" پر "EURIPIDIES" کی چوری کا الزام یا "SHAKESPEARE" پر "BELLI FOREST, CINTHIO, RICHE, NORTH, HOLINSHED LODGE" اور بہت سے ایسے دوسرے مصنفوں کی چوری کا الزام لگانا اور یہ الزام تراشی ہے۔ جسے کوئی سمجھ دار آدمی بقائمیِ ہوش وحواس اختیار نہیں کرے گا۔ وائلڈر خواہ کتنا ہی "JOYCE" سے متاثر ہوا اس نے جو کچھ "JOYCE" سے ادھار لیا ہے اسے اچھی طرح اپنا لیا ہے۔ اس کے عظیم ڈرامے میں اس کا اپنا قلم بالکل نمایاں

ہے اور میرے خیال میں امریکی تھیٹر کو سب سے زیادہ عظمت اسی فلم نے بخشی ہے۔ اس ڈرامے کو "ORT TOWN" سے قدرے گھٹیا قرار دیا جانے کی صرف ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے اور وہ ہے علما کی احتیاط پسندی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ "CAMP-BELL" اور "ROBINSON" کے الزامات کے سامنے دل چھوڑ بیٹھے ہیں اور اس کو کماحقہ دو ٹوک جواب دینے سے گریز کرتے ہیں۔

"THE SKIN OF OUR TEETH" کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے قلم اٹھانا اور جگہ کی قید لگانا بڑی پریشان کن بات ہے۔ کیونکہ اس پر الگ ایک ضخیم تحقیقی کتاب بھی لکھی جائے تو کم ہے۔ اس کے مصنف کے بقول "یہ کتاب اُس وقت لکھی گئی جس وقت ہم نے جنگ میں شرکت کی۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت طاقتور جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔" ہمارے خیال میں ان الفاظ کا اضافہ ہونا چاہیے کہ جوشِ تخیل نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ یہ تصنیف ہیئت اور معنی کے لحاظ سے بڑی وسیع ہے جو ایک ہی زبان میں ہونے کے باوجود ہماری صدی کی بہترین تصنیف ثابت ہوگی۔ یہ تصنیف زندگی کی حرارت سے لبریز ہے۔ جذبے اور دانش سے روشن ہے اور تمام مشکلات کے باوجود زندگی کی اعلیٰ مسرتوں سے معمور ہے۔ اس تصنیف میں وائلڈر اپنی ذہنی قابلیتوں کی متضاد خصوصیتوں پر حاوی نظر آتا ہے اور اپنے ابتدائی تجربوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ان سب کے مرکب سے ایک حیرت انگیز اور پیچیدہ اچھوتی اکائی کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کے ایجاز و اختصار کی محیر العقول پیچیدہ واقعات کے ترقی پذیر سلسلے میں جھلکتی ہے تاہم سارے ڈرامے میں اعلیٰ قسم کا ہلکا انداز ملتا ہے۔ جس کے نشو و نما میں اس کے سنجیدہ لمحات

کے پہلو بہ پہلو مضحکہ خیز لمحات کی کرشمہ سازیاں عمل پیرا ہیں۔ کوئی امریکی ڈرامہ شاید ہی اس سے زیادہ سنجیدہ ہو حالانکہ اس کے مزاحیہ اثرات اتنے ہی مضحکہ خیز ہیں جتنے "THE MATCH MAKER" کے اثرات۔ بادی النظر میں "ANTROBUS" محض ایک امریکی خاندان ہے۔ بہ نظر غور دیکھا جائے تو وہ ساری دنیا کا خاندان ہے۔ کہانی زمانہ حال سے متعلق ہے، لیکن اس میں گلیشیروں کے زمانے، زمانہ قبل از تاریخ انجیل کے زمانے اور کلاسیک کے عہد سے لے کر بیسویں صدی تک تمام انسانی نسل کی مکمل تاریخ کو بیان کر دیا گیا ہے۔ وائلڈر کا وہ پرانا طریقہ جس کے ذریعے وہ ماضی اور حال کو جان بوجھ کر خلط ملط کر کے وقت کے متعلق ابہام پیدا کرتا ہے یہاں ایک فلسفیانہ نوعیت اختیار کر لیتا ہے، لیکن زمانی اعتبار سے لامحدود ہونے کی بنا پر اس میں عام انسانیت کے متقابل فسطائیت، نازی ازم اور کمیونزم جیسی ترقی پذیر منظم بربریتوں کے معنّے کو ڈرامائی انداز سے پیش کرتا ہے "HENRY" "ایسے ہی نظام ہائے زندگی کی آواز ہے جو چلاتا ہے" میں آزاد ہو کر رہوں گا" خواہ مجھے تمام دنیا کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑے"۔ اسے دیکھ کر نارمل انسانیت حیرت سے چلاتی ہے" ہمیں اب جس چیز کا سامنا ہے اس کے مقابلے میں جنگ، جنگ نہیں بلکہ ایک دلولہ ہے جو ہمارے دوش بدوش امن کے زمانے کی تعمیر میں مصروفِ جہاد ہے"۔ یہ الفاظ سب سے پہلے ۱۹۴۲ء میں سنے گئے اور یہ جذبات ۱۹۶۰ء کے دور میں پہلے سے کہیں زیادہ صادق اور پُر جوش معلوم ہوتے ہیں۔

یہ ڈرامہ بڑی مہارت اور احتیاط سے تیار کیا گیا ہے اور اس کا موضوع یہ ہے کہ فطرت کی تباہ کن طاقتوں اور انسان کی اپنی ہلاکت آفرین حماقت، جہالت، تشدد

غیر جانب داری اور بزدلی کے باوجود کسی نہ کسی طرح زندہ رہنے کا چارہ کیا جائے اور انسان نے آج تک علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا جو بے بہا خزانہ جمع کیا ہے اس سے محروم ہو جانے کے خطرے کے باوجود، ذہنی طور پر اس محرومی کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی آگے بڑھنا چاہیے" "ANTROBUS" دو حرفوں میں موضوع کو یوں بیان کرتا ہے "ہم بہت طویل مسافت طے کر آئے ہیں ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے اور بہت کچھ سیکھ رہے ہیں بلندیوں پر پہنچنے کے وہ تمام اقدامات جن سے انسانی ترقی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور جن کے زیر اثر مستقبل کی رفعتوں کو چھونا ابھی باقی ہے۔ اصل میں وہ عظیم کتابیں ہیں جو ہر نسل کا ورثہ ہیں۔

"ANTROBUS" کا خاندان نسل انسانی کا نمائندہ ہے۔ اس سے ہماری سب سے پہلی ملاقات ہوتی ہے تو بنی نوع انسان پہلے ہی عدم کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔ "مسٹر ANTROBUS" (آدم یا ابدی مرد) نے ابھی ابھی گول چکر یا پہیہ ایجاد کیا ہے، حساب کے پہاڑے تیار کر چکا ہے اور حرفِ ابجد ایجاد کر رہا ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک وفادار خاوند اور شفیق باپ ہے۔ وہ کلیسا کا ستون ہے اور اسے برادری کے تمام بہترین مفادات دل سے عزیز ہیں۔ "MRS. ANTROBUS" (حوا) صرف اپنے بچوں کے لیے زندہ ہے "وہ اپنے بچوں کی ہر طریقے پر امداد کرنے کو تیار ہے خواہ باقی ہم سب اس کے قدموں پر مردہ پڑے ہوں۔ وہ یہ منظر دیکھنا گوارا کرے گی اور اس کے بدن کا ایک بھی رونگٹا کھڑا نہ ہوگا۔" اب ان کے دو بچے ہیں ایک "HENRK" (قابیل) ہے جو ہاتھ میں پتھر اٹھا کر ایک پرندے سے لے کر اپنے بڑے بھائی تک کو نشانہ بنا سکتا ہے اور دوسرا "GLADYS"

ان کی دختر جو ایک ایسا کردار ہے جو " ANTROBUS" کے خیال میں انسانی نسل کے مستقبل کی بہترین امیدوں کا مخزن ہے۔ اس خاندان کا ایک اور مستقل رکن ایک نوکرانی "SABINA" ہے وہ ایک مغرور غیر مطیئن اور فنوطیت زدہ عورت ہے۔ معاشرہ پُر امن طور پر مصروف کار ہو تو وہ "ANTROBUS" کو رُسوا کن مسرتوں کی دعوت دیتی ہے۔ تباہی اٹل معلوم ہوتی ہے تو اس کی بزدلی اسے ذلیل کُن غلامی کے درجے تک گرا دیتی ہے۔

اچانک ایک دروازے پر برف جمع ہو جاتی ہے۔ ان کا گھر آنکھوں کے سامنے غائب ہو رہا ہے لیکن "ANTROBUS" اپنی ایجادات میں مصروف ہے۔ اس کی بیوی حتی الوسع خاندان کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کا خاوند تار کے ہرکارے کے ہاتھ خیریت کا پیغام بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ "شیکسپیر کے سوا سب کچھ جلا دو۔" وہ غصّے میں بڑبڑاتی ہے "ہوں مردوا۔ جانتا ہے کہ میں اپنے بچے کو سردی سے بچانے کے لیے ایک کیا دس شیکسپیر بھی جلا ڈالوں گی۔" جیسے ہی گلیشیر گھر کے قریب پہنچتا ہے۔ "ANTROBUS" بھی گھر پہنچ جاتا ہے اور اپنا نیا ایجاد کردہ پیہّہ ہاتھ میں لیے گھما رہا ہے اور خوشی سے چلا رہا ہے:

"ہم موج کی چوٹی پر پہنچ گئے ہیں اب ہمیں کچھ نہیں کرنا ہے۔" اس کی بیوی اسے یاد دلاتی ہے کہ ان سب کی زندگی خطرے میں ہے لیکن وہ اپنے گھر کے نیچے پناہ دینے کے لیے ہومر، موسیٰ اور "MUSES" کو لے آتا ہے۔ وہ انھیں اپنی قلیل خوراک میں اس شرط پر شریک ہونے کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے پالتو جانوروں، اژدہوں اور قوی ہیکل چڑیالوں کو تباہ ہونے کے لیے

گھر سے باہر نکال دے بقائے انسانی کے کام میں دوبارہ مصروف ہو جانے کے بعد "ANTROBUS" اس شغل کو فوراً چھوڑ دینے پر تیار ہو جاتا ہے لیکن اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ "HENRY" ممانعت کے باوجود پتھر پھینکتا رہا ہے اور غالباً اس نے اپنے پڑوسی کے لڑکے کو مار ڈالا ہے۔ اپنے خاوند کو اتنا خاموش دیکھ کر "MRS ANTROBUS" گھر کی طمانیت بخش فضا مہیا کرتی ہے اور "MUSES" کو گانے کی ترغیب دلاتی ہے "GLADYS" اس کو LONG FELLOW کی نظم سناتی ہے جو اس نے حفظ کر رکھی ہیں اور اسے وہ کارڈ دکھاتی ہے جس پر سکول کی طرف سے اسے بہترین رپورٹ ملی ہے "ANTROBUS" جب دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی "GLADYS" کو انجیل پڑھا رہی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ ابھی کچھ امید باقی ہے "SABINA" ان کرسیوں کو جلانا شروع کر دیتی ہے جو سامعین نے نظر میں پھینکی ہیں "ANTROBUS" اضطراری کیفیت میں "HENRY" کو سہارے یاد کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

دوسرے ایکٹ میں طوفان نوح سے پہلے کی دنیا کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مقام "ATLANTIC CITY" ہے جہاں دیو قامت چوپایوں اور دوسرے ادنیٰ جانوروں کا کنونشن اسی زور شور اور دھوم دھڑکے سے ہو رہا ہے جو ایسے بھاری اجتماعات کا خاصہ ہے۔ اس کا صدر "ANTROBUS" ماضی کا جائزہ لیتا ہے "جب میرے والدین نے مجھے دو پاؤں پر کھڑا ہونا سکھایا تو انھیں ذرا خیال بھی نہ تھا کہ میں اس مقام پر پہنچ جاؤں گا" اس کی بیوی "ELEANOR ROOSEVELT" کے "SYNDICATED COLUMNS" کے سادہ اسلوب میں پورے اعتماد سے ذاتی

اور عام واقعات کی نشریات کے ذریعے عورتوں کے مفاد کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچاتی ہے۔ اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لیے قابل تشویش وہ کھیلیں ہیں جو "BINGOPARLOR" میں جاری ہیں۔ وہاں جی کھول کر داد عیش دی جا رہی ہے۔ حاضرین اس جوش میں کا مذاق اڑاتے ہیں جو اعلان کرتا ہے کہ طوفان نوح آ رہا ہے۔ خود "ANTROBUS" بھی جس کا سرکامیابی کے نشے میں چکرا گیا ہے بہکنے لگا ہے اور دوبارہ "SABINA" کے فریب میں پھنس گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے طلاق کا مطالبہ کرتا ہے "HENRY" ایک کالے آدمی کو پتھر سے مار دیتا ہے اور "GLADYS" بھی بازاری عورتوں کے سے اطوار اختیار کر لیتی ہے۔ تمام انسانی نسل گمراہ ہو چکی ہے اور طوفان کی آمد کی خبر مل چکی ہے اور طوفان کی آمد کی خبر مل چکی ہے، لیکن مسز "ANTROBUS" کسی حالت میں بھی توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ وہ اب بھی اپنی فطرت پر قائم ہے اور اپنے خاوند کو طلاق دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ اپنے خاوند کی خامیوں سے شادی کے وقت بھی پوری طرح آگاہ تھی، لیکن وہ اپنے خاوند سے کہتی ہے کہ جس چیز نے انھیں مضبوط رشتے میں باندھ دیا تھا وہ دونوں کا مقدس وعدہ تھا جو انھوں نے ایک دوسرے سے کیا تھا اور صرف اس یقین دہانی کی بدولت جو اس وعدے میں مضمر ہے آج تک بنی نوع انسان ختم ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ "ANTROBUS" آخری لمحے میں خود تباہی سے بچ جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی بصیرت کے ذریعے اپنی بے وقوفی سے باخبر ہو جاتا ہے اور اپنی نسل کو پھر سے محفوظ کر لیتا ہے۔ بے وقوف لوگ ابھی تک "BINGOPALOR" میں ہیں۔ جیسے

ہی طوفان چڑھتا ہے اور "ANTROBUS" کا خاندان دوڑ کر کشتی میں سوار ہوتا ہے۔ جو تشی ان کے عقب سے للکارتا ہے "دوبارہ غور کرو۔ ایک نئی دنیا تعمیر کرنے پر دوبارہ غور کرو۔" تاہم آخری ایکٹ ظاہر کرتا ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں نئی دنیا نہیں جو انسان نے نئے سرے سے ترتیب دی ہے۔ عالمگیر جنگ نے ہر چیز کو تباہ کر دیا ہے اور لوگوں کو زیرِ زمین زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے، لیکن امن دوبارہ قائم ہو گیا ہے "GLADYS" کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ ہے اور "ANTROBUS" اپنی پیاری کتابوں سے جوش اور ولولہ حاصل کرتا ہے اور نئے مستقبل کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ آخری سطریں ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ اس کے خاندان کے لوگ "اسی قدر پُر اعتماد ہیں۔ جس قدر روزِ ازل تھے۔" کیا مستقبل پہلے سے بہتر ہوگا؟ اس کی رجائیت پسندی اور پختہ ارادہ اسے بہتر مستقبل کا یقین دلاتے ہیں۔ اسی طرح اس کی بیوی کی خانہ داری کی اقدار سے وابستگی اور اسکی لڑکی کی نیکی اور شرافت بھی اسے بہتر مستقبل کی امید دلاتی ہے، لیکن اس کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹیں حائل رہیں گی۔ جن سے اسے نمٹنا پڑے گا۔ "HENRY" کی فطری بدی اور ظلم، دورانِ ارتقا "ANTROBUS" کا اپنا کمزوری کی طرف رجحان "SABINA" کی مستقل قنوطیت اور کم سے کم مزاحمت کو ترجیح دینے کی عادت اور برف، طوفان اور سیلاب کے ساتھ قدرت کے غیر متوقع اور اچانک حملے وغیرہ چند رکاوٹیں ہیں جو ان کی راہ میں حائل ہیں۔ تاہم انسان زیادہ تر اپنی تقدیر آپ بناتا ہے اگرچہ یہ دشوار کام ہے لیکن اس سے فرار مشکل ہے یا انسان کو ہر وقت طوفانِ نوح کے تجربے کی مشعل کو نگاہ میں رکھنا چاہیے اور جلد سے جلد

معاشرے کی تعبیر کرنا چاہیے۔ خدا نے طوفانِ نوح کے وقت تقریباً انسانی نسل کو ختم کر دیا تھا۔ اگر انسان دوبارہ اسی غلطی کا ارتکاب کرے گا تو خدا انسان جیسی نجر باتی تخلیق سے اکتا کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ بظاہر وائلڈر یہ سوال نہیں اٹھاتا لیکن وہ زندگی کے عین اسرار کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے اور ان کے متعلق سوال کرتا ہے۔ اس کے ڈرامے کی یہی ایک ممکن تشریح ہے۔

اس کھیل میں ڈرامہ نگار کی شاندار کامیابی کا سبب نہ صرف اس کی یہ قابلیت ہے جس کی بدولت وہ مزاحیہ اور سنجیدہ عناصر کو ہم آہنگ کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ اس کی قدیم تکنیک اور طریقے بھی ہیں (مثلاً وقت کو دوربین کے ذریعے قریب لا کر دکھانا، سٹیج منیجر کی گوناگوں سرگرمیاں، مناظر کی سادگی اور فلسفیانہ و شاعرانہ خیالات کی رنگین آمیزش وغیرہ) اس کے علاوہ اس کی کامیابی کا راز یہ بات بھی ہے کہ اس کے ایکٹر اداکاری ترک کر کے سامعین کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ ان کے کام اور کھیل کے دوران میں پیش آنے والے مسائل پر تبادلہ خیال کریں اور بحث کے بعد ذاتی لاینحل مسائل کا اعتراف بھی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس طریقے سے وائلڈر اپنی تصنیف میں بہت سی وسعتیں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اپنے پسندیدہ عقائد میں سے ایک عقیدے کو ذہنوں میں کامیابی سے بٹھا دیتا ہے۔ کسی کھیل کی فن کارانہ اہمیت ایک حد تک اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں منحصر ہے کہ آخر ڈرامہ ایک ایسی چیز ہے جس میں حقیقت کی تلاش نقالی کے ذریعے کی جاتی ہے۔

اپنے آخری ناول "THE IDES OF MARCH" ۱۹۴۸ء کے لکھنے

کے بعد سے کہ آج تک وائلڈر اٹلی میں فضائیہ کے جاسوسی کے محکمہ میں ملازمت کر نا رہا ہے۔ مسولینی کی آمریت کے خلاف جنگ میں اس کا ایک گہرا شاعر دوست "LAURO DE BOSIS" کام آیا۔ اس میں اپنے ان تجربات کو اس کتاب کی تشکیل کی بنیاد بنایا ہے اور بتاتا ہے کہ اس نے کیوں اس کتاب میں یورپی ڈکٹیٹروں کو سیزر کی شکل میں پیش کیا ہے تاہم قاری کو وائلڈر کے بیان سے بہت کم اتفاق ہوگا کیونکہ اس کا سیزر بنیادی طور پر ایک شریف النفس کُرخیز کردار ہے اور اسے مسولینی، ہٹلر یا سٹالن کے کردار سے کوئی مشابہت نہیں جن سے اب ساری دنیا آگاہ ہے۔ وائلڈر کو تمام اقسام کے جرائم پیشہ لوگوں یا ذہنی مریضوں کی نفسیات کی تحقیقات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ یہی خصوصیت اسے اپنے ہم عصروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔ مسولینی کو اپنے ذہن میں رکھنا تو کجا وائلڈر نے اپنے سیزر کی تخلیق کے وقت نہ صرف اس بظاہر پُرشکوہ لیکن بباطن کھوکھلے اطالوی (سیزر) کے تصور کو نظرانداز کر دیا ہوگا بلکہ وہ انسانیت سے گرے ہوئے آسٹریائی (ہٹلر) اور بربریت پسند جارجین (سٹالن) کو بھی تصور میں نہیں لایا ہوگا۔ تاہم اس نے ان ڈکٹیٹروں کو اس حد تک استعمال کیا ہے جس حد تک ان کی ملک گیری کی وہ ہوس ظاہر کرنی مقصود ہے ضرور جس کی بنا پر انھوں نے دنیا کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا اور یہ اس نے محض اس غرض سے کیا ہے کہ وہ ایک البیلا "JULIUS CAESER" تخلیق کر سکے جو سلطنت روما کا سب سے بڑا معمار اور اس کا ڈکٹیٹر بھی تھا۔ وائلڈر نے سیزر کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ نسل انسانی کے ان دشمنوں یعنی بیسویں صدی کے ڈکٹیٹروں سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا کہ اس مزاحیہ خاکے سے جو کہ شیکسپیئر نے عظیم "JULIUS CAESER" کا کھینچا

تھا شیکسپیر کا ہیرو" BRUTUS "تھا سیزر نہ تھا۔ انسانیت دوستی وائلڈر کے پختہ اور حقیقی ایمان کی دلیل ہے اور وہ اس قوتِ ایمانی کے بل پر کوئی نہ کوئی فلسفیانہ آدرش ڈھونڈ نکالتا ہے اور وہ بھی اس زمانے میں جبکہ ہر طرف بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔ بطور ڈرامہ نگار کے اس کی قابلیت کی یہ زندہ مثال ہے کہ اس نے ایک پُرآشوب اور انتشار انگیز زمانے میں ایک بے نظیر ناول لکھ کر روم کے ڈکٹیٹر کے المیہ پہلو سے پردہ اٹھایا۔

ان صفحات میں ہماری ملاقات جس" JULIUS CAESAR "سے ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسا آدمی ہے جو بُردبار ہے۔ اس کی شخصیت پُرکشش ہے۔ وہ دشمنوں پر بھی رحم کھاتا ہے بے خوف ہے اور اپنے کیسے پن سمجھتا نہیں وہ اپنے ہر شناسا سے بہترین اخلاق سے پیش آتا ہے۔ اس کی خامیاں (اور وہ اپنی خامیوں سے پوری طرح آگاہ ہے) اس کی نیکیوں کا شاخسانہ ہیں شیکسپیر کے سیزر کے بالکل برعکس وہ تصور کا دشمن نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز جاننے کی خواہش کرتا ہے۔ وہ بہت بڑا قاری ہے۔ اسے محض فکر اور سوچ بچار سے چڑ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے ہر وقت مصروف رہنا چاہیے۔ ہم میں سے اکثر لیسا اوقات جان بوجھ کر فیصلہ کرنے سے انکار کرتے ہیں یا اندھا دھند فیصلہ کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس وہ فیصلے کرنے کا عادی ہے۔ وہ اپنے ذہن کو اس وقت بالکل سمجھتا ہے جب وہ اہم نتائج کے ساتھ برسرِ آزمائش کر رہا ہو۔ سیزر کسی بھی ذمہ داری سے کنی نہیں کتراتا "بلکہ سلطنت کی تقدیریں اپنے ہاتھ میں لینے پر خوشی محسوس کرتا ہے" ذمہ داری کے سوا اور کسی چیز میں آزادی نہیں "یہ ہے اُس کا ایمان اور اس کے ہیئے ذہن کو حرکت میں لانے

والی مرکزی قوت بغیر حدود آزادی کی خواہش ہے"۔ ایسا آدمی صرف اسی وقت محسوس کرسکتا ہے کہ اس کی خواہش پوری ہوگئی ہے جبکہ وہ چوٹی پر پہنچ چکا ہو۔ چوٹی پر پہنچ کر اور لاتعداد ذمہ داریاں سنبھال کر اس کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اسے اتنی بھی ذاتی آزادی میسر نہیں آتی جو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شہری کو نصیب ہو۔

وہ انتقام پرست نہیں ہے۔ وہ اپنے جانی دشمنوں کو بھی سزا دینے میں خوشی محسوس نہیں کرتا۔ اسے کسی انسانی رویّے پر حیرت نہیں ہوتی یعنی وہ بداخلاقی کے سوا ہر چیز برداشت کر سکتا ہے اور جب وہ لوگ بھی اس کے خلاف سازش کرنے لگتے ہیں جن پر اس نے ان گنت احسان کیے ہیں تو اسے کوئی صدمہ نہیں ہوتا "صرف کتّے ہی اپنے مالکوں کو کبھی نہیں کاٹتے" وہ جانتا ہے کہ ایک دن اُسے قتل کر دیا جائے گا اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامنے صرف دو راستے ہیں یا وہ اپنے قتل ہونے کے حادثے کو نظر انداز کر دے یا مسلسل خوف و ہراس کی زندگی بسر کرے۔ (اگر میں میزرہ ہوتا تو اس کا قاتل ہوتا) لہٰذا وہ پہلے راستے کا انتخاب کرتا ہے۔

اس امر کے باوجود کہ وہ کبھی بدتہذیبی یا بے ادبی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور ہمیشہ نرمی اور خوش مزاجی سے پیش آتا ہے، اس کی زندگی محبت سے تہی دامن ہے۔ اس کا طبیب جو اس کی انتہائی عزت کرتا ہے وہ بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ جب کبھی اسے اس سے دور رہنے کا موقع ملتا ہے، اسے سکون اور آرام محسوس ہوتا ہے۔ اس کے صرف دو شخصوں سے گہرے تعلقات ہیں ایک بڑی بوڑھی "JULIA" سے جو اس کی چچی ہے اور ایک "LUCIUS MAMILIUS TURRINUS" جو اس کا بچپن کا دوست اور ہم پیشہ فوجی رفیق ہے اور جس کے بارے میں لوگوں کا خیال

ہے کہ وہ عرصہ ہوا مر چکا ہے، لیکن وہ " CAPRI " میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا ہے۔ تاہم وہ ان سے بھی بہت کم ملتا ہے اور ان کے ساتھ بھی خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کی بیوی ایک بے وقوف اور پھوہڑ عورت ہے۔ وہ بڑے صبر و تحمل سے اس کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ ان کے درمیان گہرا اُنس نہیں، خط و کتابت بھی نہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ جو محبت بھرا جذبہ کبھی اس کے دل میں قلوپطرہ کے لیے موجود تھا اسے وہ خیر باد کہہ چکا ہے، لیکن وہ دوبارہ روم آتی ہے تو اس کے دل میں پرانا جذبہ پھر جاگ اٹھتا ہے تاہم ظاہری رکھ رکھاؤ اور درباری تکلفات کی پاسداری کرنے کی وجہ سے اسے قلوپطرہ سے چوری چھپے ہی ملنے کا موقع مل سکتا ہے۔ دنیا درست سمجھتی ہے کہ سیزر کسی سے محبت نہیں کرتا اور نہ وہ محبت کرنے کے قابل ہے۔ یہ رائے اس لیے درست ہے کہ وہ تین شخص جن کو وہ عزیز جانتا ہے، اس کی زندگی اور اس کے کارناموں کے مرکز سے بہت دور ہیں۔ یہ امر درست ہے کہ اس نے ان تمام عورتوں سے تعلقات کشیدہ کر لیے ہیں جو ماضی میں اس کی ملکہ رہ چکی ہیں، لیکن وہ ان سے اس درجہ کٹ گیا ہے کہ ان سے ملنے سے اسے کسی گرمجوشی کا احساس نہیں ہوتا۔ تاہم خوشامدی اسے چاروں طرف سے گھیرے رکھتے ہیں۔ بعض احمق اور جنونی اس پر اصرار کرتے ہیں کہ وہ سچ مچ ایک دیوتا ہے۔ لیکن سیزر کو ان تمام باتوں سے دلی نفرت ہے اسے "CATULLUS" شاعر سے انتہائی نفرت ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی اعلیٰ ذہانت سے بہت مرعوب ہے۔ وہ اپنی ذات کی پرستش کے مقابلے میں شاعر کی نفرت کو قابل قدر تصور کرتا ہے۔

وہ ایک ایسا شخص ہے جو صرف رعایا یا سلطنت کی ذمہ داریوں کی خاطر زندہ ہے۔ وہ توہم پرستی کا دشمن ہے اور مذہب کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ زندگی کی پُراسرار قوتوں کی کارفرمائی سے آگاہ ہے، لیکن علم سے اس درجہ محبت کرتا ہے کہ ان کی پُراسرار قوتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتا۔ اس کی خواہش ہے کہ ایک منطقی ذہن کے لیے دنیا کی ہر چیز قابلِ فہم ہو جائے۔ وہ مذہب کی اہمیت کا قائل ہے، لیکن اس کی تشکیک کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ مذاکرتا ہے کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس قسم کی اطلاعات سے بھرپور ہوں جن سے پتہ چلے کہ دنیا کے معاملات خود بخود اس طرح آگے بڑھ رہے ہیں جیسے طرح ایک ندی اپنی طوفانی موجوں پر چند پتّوں کو اٹھائے چلی جاتی ہے۔"

وہ ایک تنہا شخص ہے لیکن وہ اپنی تنہائی کا دوسروں کو احساس تک نہیں ہونے دیتا۔ سالانکہ وہ ساری دنیا سے کٹا ہوا ہے۔ اس کی یہ دریافت کہ آزادی کے معنی ذمہ داری کا احساس ہے ایک نہایت اہم چیز ہے۔ اس بنا پر "BRUTUS" اور دوسرے سازشی اس کے مقابلے میں بہت ادنیٰ آدمی ہیں، لیکن اس کی ذمہ داریوں میں وہ کام شامل نہیں ہیں جو سب سے زیادہ اہم ہیں یعنی وہ کام جن کا خمیر محبت سے اٹھتا ہے اور جو ہمارے اور ابدیت کے درمیان اصل رابطہ ہیں۔ سیزر اپنی تمام ہوشیاری، ہمدردی اور تہذیب کے باوجود ایک ایسا آدمی ہے جس کی روحانی زندگی تک رسائی نہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانی قوت کے حصول میں کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔

"THE IDES OF MARCH" کو بجا طور پر اسی طرح رومن کلاسیک کا درجہ دیا جا سکتا ہے جس طرح "THE WOMAN OF ANDROS" کو یونانی کلاسیک اور

"THE CABALA" کو اطالوی کلاسیک کہا جا سکتا ہے (سوال یہ ہے کہ روم کلاسیک اتنی زیادہ اطالوی کیوں نہیں معلوم ہوتی) وائلڈر کی زبان جو "THE WOMAN OF ANDROS" میں صاف اور شستہ ہے اور جو "HEAVEN'S MY DESTINATION" میں امریکہ کے مغرب وسطیٰ کی مقامی بول چال ہے یہاں اگر لاطینی زبان کی بلند آہنگی اور منطقی و عقلی بوجھ کی حامل بن جاتی ہے تاہم شاید ہی کسی ادیب نے ایک عام قاری کی مجبوریوں کو اتنا پیشِ نظر رکھا ہو۔ یہ ناول اس مفروضے پر لکھا گیا ہے کہ ایک عام قاری کو رومی تاریخ و ادب کا تھوڑا بہت علم ہے۔ علاوہ ازیں اسے ایک ایسی ہیئت میں ڈھالا گیا ہے جو ناول نگار کے مقاصد کے لیے نہایت موزوں ہے لیکن یہ ایک ایسی ہیئت ہے جس کے بارے میں کتاب کے دوسرے صفحے کی سطور کو پیشِ نظر رکھ کر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ غیر تربیت یافتہ قاری کے بس کا روگ نہیں۔ یہ انگریزی ناول نگاری کے قدیم ترین طریقے، یعنی خطوط نویسی کے طریقے سے بہت مختلف ہے اور وائلڈر اپنی کہانی بسا اوقات غیر متعلقہ "دستاویزات" کے ذریعے بیان کرتا ہے (اور یہ دستاویزات آخری صفحے اور شاعر "CATULLUS" کے اقتباسات اور حوالوں کے علاوہ سب وائلڈر کی اپنی ایجاد ہیں۔ اس اسلوب سے ناول نویس یہ فائدہ اُٹھاتا ہے کہ وہ اپنے وجود اور مداخلت کا احساس دلائے بغیر ہر قاری کے اندر موجود رہتا ہے۔ اس طریقے سے وہ ایک "ہمہ بیں مصنف ثابت ہوتا ہے" یہ مسودات بااختیار لوگوں کے احکام، خطوط، اعلانات، لوک گیتوں کے ٹکڑے، دیواروں پر گھسیٹی ہوئی عبارتوں، اور "CATULLUS" کی نظموں کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ یہ دل کش ناول وائلڈر کی ان بڑی تصانیف کے سلسلے کی آخری کڑی ہے جو اس نے

آج تک انگریزی میں لکھی ہیں۔
لیکن اس کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھتا۔ اس سے ایک سال پہلے ۱۹۴۷ء میں اس نے "CENTURY CLUB" کے صد سالہ جشن کے لیے تین ایکٹ کا دلفریب ڈرامہ لکھا جس کا عنوان "OUR CENTURY" تھا اور وہ محدود تعداد میں چھاپا گیا تھا۔ اس میں اس کلب کو، اس کے ارکان کے فرزندوں، نئے ممبروں اور ان کی بیویوں کی نظر سے پیش کیا گیا تھا "THE MATCHMAKER" کے بعد اس نے ایک مذہبی ڈرامہ "THE ALCESTIAD" تحریر کیا۔ اس کے پہلے حصے میں دکھایا گیا ہے کہ نوجوان "ALCESTIAD" شادی سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی خدا کے لیے وقف کر دینا چاہتی ہے اور پھر "ADMETUS" کی خاطر دنیاوی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ دوسرے حصے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ "ADMETUS" کی جگہ اپنی جان پیش کرتی ہے اور تیسرے حصے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد اُسے روحانی طور پر خدا کا وصال نصیب ہو جاتا ہے۔ اس کا جو تھا حصہ ابھی تک انگریزی میں "THE DRUNKEN SISTER" کے عنوان سے "ATLANTIC MONTHLY" میں چھپا ہے۔ اس میں سورج دیوتا تقدیر کی تین دیویوں سے "ADMETUS" کی زندگی ایک چال کے ذریعے حاصل کر لیتا ہے "THE ALCESTIAD" کا ترجمہ جرمن زبان میں ہوا اور چھپنے سے پہلے یورپ بھر میں جگہ جگہ ایک ڈرامے اور اوپیرا کی شکل میں پیش کیا گیا اور اسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔
حال ہی میں وائلڈر ایک ایکٹ کے دو ڈراموں پر ایک ساتھ محنت کرتا رہا ہے۔ دو ڈرامے یعنی "THE SEVEN AGES OF MAN" اور "THE SEVEN DEADLY SINS" اول الذکر

"SOMEONE FROM ACSISI" سے اخذ کیا گیا ہے جو سینٹ فرانس کی زندگی کے آخری ایام کے واقعے کی نیم تمثیلی طنزیہ صورت ہے "CHILDHOOD" (جو کہ "ATLANTIC MONTHLY" میں چھپ چکا ہے) دوسرے ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ وہ خوابوں کی اس دنیا کی نہایت نازک اور دلفریب تصویر ہے جس میں بچے رہتے ہیں۔ یعنی اس دنیا کی تصویر جس میں وہ بالغوں کو گھسنے نہیں دیتے۔ "INFANCY" بھی "THE SEVEN AGES OF MAN" سے لیا گیا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ بھی وائلڈر کے بہترین ایک ایکٹ کے ڈراموں میں سے ہے "INFANCY" خود میرا پسندیدہ ڈرامہ ہے یہ بڑا مزاج انگیز فارس ہے جس میں قدیم "KEYSTONE COMEDY" کی خاموش تصویروں کی روایات کو کامیاب طریقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بالکل نئی ذہنی تخلیق ہے۔ اس میں ان معصوم بچوں کے غصے اور مایوسی کو پیش کیا گیا ہے جو ابھی کمسن اور معصوم ہیں۔ ان کے غصے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ پورے الفاظ ادا نہیں کر سکتے اور تھوڑی سی محنت کے بعد تھک جاتے ہیں۔ اس لیے بالغوں کی دنیا کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی کوششوں میں بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف گھر والے بڑے لوگ اس تصور سے ہر وقت بے چینی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان بچوں کو اپنے گرد و پیش رونما ہونے والی ہر بات کا شعور ہے۔ چنانچہ ایک معصوم بچے کی ماں شکایت کرتی ہے "وہ بچہ فرش پر بیٹا رہتا ہے اور جو لفظ ہماری زبان سے نکلتا ہے اسے غور سے سنتا ہے۔ پہلے پہل میرے خاوند نے بچے کے سامنے الفاظ کے ہجوں میں باتیں کرنا شروع کیں لیکن "ALBRT EINSTIN"

یہ تمام لفظ دو ہفتوں میں سیکھ گیا۔" مگر مخاطب خاتون احتجاج کرتی ہے کہ معصوم یا دودھ پیتا بچہ ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ تو بچے کی والدہ فوراً جواب دیتی ہے "اپنے اپنے علم کی بات ہے۔" بعد میں دونوں معصوم بچوں کو تبدیل کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دودھ پینے بچے بالغوں کی کافی زبان سمجھتے ہیں۔

عام روش یہ ہے کہ آخری چند پیروں میں پہلے لکھی ہوئی باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے، لیکن وائلڈر ابتدا ہی میں اس وطیرہ سے نفرت کا اظہار کر چکا ہے۔ اس لیے میں اس بلاغت کے ارتکاب سے پرہیز کرتا ہوں۔ پھر بھی ہم اتنا اضافہ کیے دیتے ہیں کہ وائلڈر کے مشاغل اس کے تصنیف و تالیف کے کام میں خلل پذیر نہیں ہوتے۔ وہ قدیم تھیٹر کے دستاویزات، غیر ملکی زبانوں اور دور دراز ملکوں کے باشندوں کے رہن سہن کے مطالعے میں محو رہتا ہے۔ اس نے ادبی مشغلے کو ہمیشہ ایک پیشہ تصور کیا ہے اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ فی زمانہ امریکہ میں کوئی ایسا ادیب پیدا نہیں ہوا جس نے وائلڈر کی طرح مکمل اعتماد کے ساتھ تصنیف و تالیف کو اپنا پیشہ بنایا ہو۔

## نشرواشاعت کوفن کادرجہ دینے والے ادارہ

## مکتبہ "میری لائبریری" کی مطبوعات

### ادب

| | | |
|---|---|---|
| اردو کا بہترین انشائی ادب، مرتب ڈاکٹر وحید قریشی | ۷-۵۰ مجلد | ۱۵-۰۰ |
| جواہر ریزے — مولانا ظفر علی خاں | ۱۰-۰۰ | |
| غبار خاطر — ابوالکلام آزاد معہ شذرات | ۴-۵۰ مجلد | ۹-۰۰ |
| تذکرہ — ابوالکلام آزاد | ۴-۵۰ مجلد | ۷-۰۰ |
| اردو شخصیت نگاری، مرتب ڈاکٹر وحید قریشی | | |

### تنقید

| | | |
|---|---|---|
| ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی | ۲-۵۰ مجلد | ۶-۰۰ |
| تنقیدی مضامین (اصناف شعر) عابد علی عابد | ۳-۵۰ " | ۶-۰۰ |
| متاع ادب — اظہر زیدی | ۳-۵۰ " | ۶-۰۰ |
| پنجابی ادب کی مختصر تاریخ، احمد حسین قریشی | ۴-۰۰ | |
| دلی، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مرتب محمد خاں اشرف | ۱-۷۵ مجلد | ۴-۰۰ |
| روش نگارش (فارسی) کاظم رجوی | ۰-۵۰ | |
| ارنسٹ ہیمنگوے (تنقیدی مطالعہ) مترجم سلیم الرحمان | ۱-۷۵ مجلد | ۲-۷۵ |
| ولیم فاکنر ( " " ) " " | ۱-۷۵ " | ۲-۷۵ |
| رالف والڈو ایمرسن، جوزیفائن مائلز مترجم رحیم | ۱-۷۵ " | ۲-۷۵ |

| | | |
|---|---|---|
| مارک ٹوین (تنقیدی مطالعہ) ایوئیس لیری مترجم سجاد حارث | ۱-۷۵ مجلد | ۲-۷۵ |
| والٹ وٹمین (″ ″ ) رچرڈ چیز ″ ″ | ″ ۱-۷۵ | ۲-۷۵ |
| ناول نگاری (تاریخ و تنقید) ڈاکٹر سہیل بخاری | ″ ۴-۵۰ | ۸-۰۰ |
| ادب اور تعصب، اکبر امامی | ″ ۱-۷۵ | ۴-۰۰ |
| باغ و بہار، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مرتب سلیم اختر | ″ ۳-۵۰ | ۸-۰۰ |
| سرشار ″ ″ ڈاکٹر احراز نقوی | ″ ۷-۵۰ | ۱۵-۰۰ |
| آغا حشر اور ان کا فن، اے۔بی اشرف | ″ ۳-۵۰ | ۷-۰۰ |
| تنقید شعر، انیس ناگی بی۔سی۔ایس | ″ ۲-۵۰ | ۶-۰۰ |
| رہ وادیٔ خیال، محمد عظیم ملک بی۔سی۔ایس | ۳-۵۰ | ۷-۰۰ |

## شاعری

| | | |
|---|---|---|
| دیوان ولی، مرتب محمد خاں اشرف، حسرت موہانی | ۲-۲۵ مجلد | ۵-۰۰ |
| دیوان مصحفی، ″ فراق گورکھپوری، حسرت موہانی | ″ ۳-۰۰ | ۶-۰۰ |
| دیوان آتش، ″ وحید قریشی، حسرت موہانی | ″ ۱-۷۵ | ۳-۵۰ |
| دیوان جرأت، ″ حسن عسکری، حسرت موہانی | ″ ۳-۵۰ | ۶-۰۰ |
| انتخاب غالب، مرتب سید اختر عباس | ۰-۵۰ | |
| دیوان غالب (اردو) مقدمے اور شرح کے ساتھ | ۳-۵۰ مجلد | ۵-۰۰ |
| غالب دیاں غزلاں (پنجابی) مترجم پروفیسر دلشاد کلانچوی | ″ ۱-۷۵ | ۴-۰۰ |
| دیوان غالب (فارسی) مرتب سید وزیر الحسن عابدی | ″ ۸-۰۰ | ۱۸-۰۰ |
| لذت آوارگی (دیوان) اے ڈی اظہر | ″ ۵-۰۰ | ۸ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| سفر دی رات (پنجابی کلام) امیر نیازی | | مجلد | ۲-۰۰ |
| ٹوٹ بُھوٹ (نظمیں) غلام مصطفےٰ تبسم | | ۲-۵۰ ″ | ۵-۰۰ |
| دریچہ سحر، جاوید ہوشیار پوری | | ۳-۰۰ ″ | ۶-۰۰ |
| آٹھ غزل گو، مرتب جاوید شاہین | | ۳-۰۰ ″ | ۶-۰۰ |

## ناول

| | | | |
|---|---|---|---|
| میدان عمل، پریم چند، مقدمہ خواجہ محمد زکریا | | ۵-۵۰ مجلد | ۸-۰۰ |
| میرے بھی صنم خانے، قرۃ العین حیدر | | ۵-۵۰ ″ | ۹-۰۰ |
| ننگی دھرتی، مس آئی لِن چانگ، مترجم اشرف | | ۵-۵۰ | |
| پتھر کا دیس | عادل رشید | ۴-۵۰ مجلد | ۷-۰۰ |
| سہرے کے پھول | ″ | ۳-۵۰ ″ | ۷-۰۰ |
| آہٹیں | ″ | ۱-۷۵ ″ | ۳-۵۰ |
| بری بات | ″ | ۴-۵۰ ″ | ۷-۰۰ |
| مضراب الفت | ″ | ۱-۷۵ | |
| دل بھولتا نہیں | جعفر علی سید | ۲-۰۰ مجلد | ۵-۰۰ |
| کرن کرن اندھیرا | آغا اشرف | ۵-۵۰ | |
| انسان | ڈاکٹر صلاح الدین اکبر | ۵-۵۰ | |
| انسان اور شیطان، | غازی محمد اسحاق | ۴-۵۰ | |
| سیماب، | بیگم کوثر خان دیباچہ ابراہیم جلیس | ۲-۵۰ مجلد | ۶-۰۰ |
| تعمیر، | خان محبوب طرزی | ۲-۵۰ | |

| | | | |
|---|---|---|---|
| منزل منزل دل بھٹکے گا | عنایت اللہ | ۲-۵۰ مجلد | ۶-۰۰ |
| ہیرے کا جگر | 〃 | ۴-۵۰ 〃 | ۸-۰۰ |
| ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ | سلمیٰ عنایت | ۳-۵۰ 〃 | ۶-۰۰ |
| دل دیا داغ لیا | آغا اشرف | ۲-۰۰ | |

## افسانہ

| | | |
|---|---|---|
| میرزا ادیب کے بہترین افسانے، مرتب عرش صدیقی | ۳-۵۰ مجلد | ۶-۰۰ |
| ندیم کے بہترین افسانے، مرتب مظفر علی سید | ۴-۵۰ 〃 | ۸-۰۰ |
| ۱۹۶۳ء کے منتخب افسانے، مرتب احراز نقوی | ۳-۰۰ | |
| ۱۹۶۴ء 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | ۳-۵۰ مجلد | ۶-۰۰ |
| ۱۹۶۵ء 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | ۳-۰۰ | |
| ۱۹۶۶ء 〃 〃 〃 مرتب ریاض احمد | ۳-۵۰ | |
| ۱۹۶۷ء 〃 〃 〃 مرتب ناصر زیدی | ۳-۵۰ | |
| زادِ راہ، پریم چند مقدمہ خواجہ محمد زکریا | ۲-۲۵ مجلد | ۵-۱۰ |
| فاصلے — سیدہ عفرا بخاری | ۲-۵۰ 〃 | ۵-۰۰ |
| خوشبو کے گھاؤ — نوید انجم | ۵-۵۰ | |
| ادھا کھایا امرود — خان فضل الرحمان | ۳-۰۰ مجلد | ۶-۰۰ |
| حریف آدم — نصیر احمد ناصر | ۳-۰۰ 〃 | ۶-۰۰ |
| حماقتیں — شفیق الرحمٰن | ۴-۵۰ 〃 | ۷-۰۰ |
| مزید حماقتیں — 〃 | ۴-۵۰ 〃 | ۸-۰۰ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| لمریں | شفیق الرحمان | ۲-۵۰ مجلد | ۵-۰۰ |
| پرواز | " | " ۲-۵۰ | ۵-۰۰ |
| افق سے افق تک | آغا اشرف | ۴-۵۰ | |
| لمحوں کے بھنور | " | ۴-۰۰ مجلد | ۷-۰۰ |
| نازلی بیگم | مولانا ظفر علی خاں | ۳-۰۰ | |
| وردآئے گا دبے پاؤں، ذکاء الرحمٰن | | ۴-۰۰ | |
| شفق کے سائے | غلام الثقلین نقوی | ۴-۰۰ مجلد | ۷-۰۰ |
| آگ اور سائے | سحر یوسف زئی | " ۳-۰۰ | ۶-۰۰ |
| چنار کی چھاؤں | لطیف کاشمیری | " ۳-۵۰ | ۷-۰۰ |

## ڈرامہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| دغاباز، کارلوگولڈونی | مترجم کمال احمد رضوی | ۱-۲۵ | |
| ننھے کی ڈائری | " | ۱-۷۵ مجلد | ۳-۵۰ |
| ٹاہلی دے تھلے | اشفاق احمد | " | ۲-۲۵ |

## مزاح

| | | | |
|---|---|---|---|
| سنگ وخشت | کنہیا لال کپور | ۲-۰۰ | ۴-۵۰ |
| شیشہ وتیشہ | " | ۲-۰۰ | ۴-۵۰ |
| چنگ ورباب | " | ۲-۰۰ | ۴-۵۰ |
| نوک نشتر | " | ۲-۰۰ | ۴-۵۰ |
| بال وپر | " | ۲-۰۰ | ۴-۵۰ |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| نرم گرم | کنہیا لال کپور | ۲-۰۰ | مجلد | ۴-۵۰ |
| گرد کارواں | 〃 | ۲-۰۰ | 〃 | ۴-۵۰ |
| دلیل سحر (نیا مجموعہ) | 〃 | ۲-۰۰ | 〃 | ۴-۰۰ |
| تل پہل (پنجابی) | 〃 | ۱-۷۵ | 〃 | ۴-۰۰ |
| اندیشۂ شہر | احمد جمال پاشا | ۲-۵۰ | 〃 | ۴-۰۰ |
| راجہ صاحب | شوکت تھانوی | ۱-۷۵ | 〃 | ۳-۵۰ |
| گرم گرم (لطیفے) | اشفاق احمد | ۱-۷۵ | 〃 | ۳-۵۰ |
| قہکار | 〃 | ۱-۵۰ | | |
| محفل معمہ گوئی | منظور الحق صدیقی | ۴-۰۰ | مجلد | ۷-۰۰ |
| پڑھو اور ہنسو | میاں ابوالفتح | ۲-۰۰ | | ۴-۵۰ |
| شہرت کی خاطر | نظیر صدیقی | | | |

## قانون

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ | ولیم او ڈگلس مترجم خضر تمیمی | ۳-۰۰ | مجلد | ۴-۰۰ |

## شکار

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| شیر شیر شیر، | عظیم شکاریوں کے سترہ شکار | ۴-۵۰ | مجلد | ۸-۰۰ |

## علم

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| معلومات کا انسائیکلوپیڈیا، | علی ناصر زیدی | ۵-۵۰ | مجلد | ۸-۰۰ |
| حلال و حرام | عطاء اللہ پالوی | ۳-۰۰ | | |
| کتاب الاخلاق | مولانا محمد بخش مسلم | | مجلد | ۹-۰۰ |

بیمہ اور اسلام   محمد بلال چودھری   ۴-۵۰ مجلد   ۶-۰۰

## عمرانیات

لباس کا مسئلہ اور ٹیڈی ازم، محمد خاں اشرف   ۱-۵۰

تعلیمات، چیئرمین ماوزے تنگ   ۲-۵۰ مجلد   ۶-۰۰

سی آئی اے کی کہانی   ۴-۵۰ ″   ۸-۰۰

## عملی نفسیات

زندگی اور عمل، ڈاکٹر مارڈن   ۲-۰۰ مجلد   ۵-۰۰

زندگی کے موڑ پر، چالیس آپ بیتیاں   ۲-۵۰ ″   ۶-۰۰

نفسیات کی روشنی   مجموعہ مضامین   ۲-۰۰ ″   ۴-۰۰

ترقی کی راہیں   حکیم و ڈاکٹر نعمان ساجد   ۲-۰۰ ″   ۵-۰۰

ہماری عادتیں ہمارے جذبات، دیانند ورما   ۱-۲۵ ″   ۲-۵۰

شادی اور کامیابی، ڈاکٹر پوسٹس چیسر   ۲-۵۰

جنس کا جسمانی پہلو، کیتھ واکر پیٹر فلیچر   ۳-۰۰ مجلد   ۶-۰۰

جنس کا نفسیاتی پہلو، کیتھ واکر   ۴-۵۰ ″   ۷-۰۰

جینے کی اہمیت، لن یوتانگ   ۱۰-۰۰ ″   ۱۵-۰۰

روزمرہ نفسیات، محمد اکرم طاہر   ۲-۰۰ ″   ۴-۰۰

دولت نامہ، ″   ۲-۵۰

بچے اور ان کی تعلیم و تربیت، صوفی گلزار احمد   ۱-۷۵ مجلد   ۳-۵۰

گفتگو اور تقریر کا فن، مترجم جاوید شاہین   ۳-۵۰ ″   ۶-۰۰

### * تنقید ، ادب ، ناول ، افسانا

| | |
|---|---|
| بہترین انشائی ادب | ۱۰٫۰۰ |
| ادب کا تنقیدی مطالعہ | ۲٫۰۰ |
| ادب اور تعصب | ۱٫۷۵ |
| ولیم فاکنر | ۱٫۷۵ |
| ارنسٹ ہیمنگوے | ۱٫۷۵ |
| مارک ٹوین | ۱٫۷۵ |
| والٹ وٹمین | ۱٫۷۵ |
| تنقیدی مضامین | ۳٫۰۰ |
| غبار خاطر | ۴٫۰۰ |
| دیوان غالب (فارسی) | ۱۰٫۰۰ |
| انتخاب غالب | ۵٫۰۰ |
| پنجابی ادب کی تاریخ | ۴٫۰۰ |
| دیوان ولی | ۲٫۲۵ |
| دیوان مصحفی | ۳٫۰۰ |
| دیوان آتش | ۱٫۷۵ |
| دیوان جرأت | ۳٫۰۰ |
| ولی ، تنقیدی مطالعہ | ۱٫۷۵ |
| متاع ادب | ۳٫۰۰ |
| ناول نگاری | ۴٫۰۰ |
| میرزا ادیب' بہترین افسانے | ۳٫۰۰ |
| احمد ندیم' بہترین افسانے | ۴٫۰۰ |
| زاد راہ معہ تنقیدی مقدمہ | ۲٫۲۵ |
| فاصلے | ۲٫۰۰ |
| میرے بھی صنم خانے | ۵٫۰۰ |
| پتھر کا دیس | ۴٫۰۰ |
| سہرے کے پھول | ۳٫۵۰ |
| آہٹیں | ۱٫۷۵ |
| منزل منزل دل بھٹکے گا | ۳٫۰۰ |
| ادھ کھایا امرود | ۳٫۰۰ |
| حریف آدم | ۳٫۰۰ |
| دغا باز (ڈرامہ) | ۱٫۰۰ |
| لفنگے کی ڈائری | ۱٫۷۵ |
| 63 کے منتخب افسانے | ۲٫۰۰ |
| 64 کے منتخب افسانے | ۳٫۰۰ |
| 65 کے منتخب افسانے | ۳٫۰۰ |
| میدان عمل معہ تنقیدی مقدمہ | ۵٫۰۰ |
| ننگی دھرتی | ۵٫۰۰ |
| لمحوں کے بھنور | ۴٫۰۰ |
| کرن کرن اندھیرا | ۵٫۰۰ |
| افق سے افق تک | ۴٫۰۰ |
| ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ | ۳٫۰۰ |
| سیلاب | ۲٫۰۰ |
| انسان | ۵٫۰۰ |
| خوشبو کے گھاؤ | ۵٫۵۰ |

### * نفسیات

| | |
|---|---|
| جینے کی اہمیت | ۱۰٫۰۰ |
| میٹھے بول میں جادو ہے | ۵٫۵۰ |
| پریشان ہونا چھوڑ دیجیے | ۵٫۵۰ |
| گفتگو اور تقریر کا فن | ۳٫۰۰ |
| مانیں نہ مانیں | ۳٫۰۰ |
| جنس کا نفسیاتی پہلو | ۴٫۰۰ |
| جنس کا جسمانی پہلو | ۳٫۰۰ |
| زندگی کے موڑ پر | ۲٫۰۰ |
| شادی اور کامیابی | ۲٫۰۰ |
| روزمرہ نفسیات | ۲٫۵۰ |
| نفسیات اور عمل | ۲٫۰۰ |
| زندگی اور عمل | ۲٫۰۰ |
| نفسیات کی روشنی | ۲٫۰۰ |
| ترقی کی راہیں | ۲٫۰۰ |
| ہماری عادتیں' ہمارے جذبات | ۱٫۲۵ |
| دولت نامہ | ۲٫۰۰ |
| بچے اور انکی تعلیم و تربیت | ۱٫۷۵ |

### * تاریخ و سوانح

| | |
|---|---|
| ابوبکر صدیق اکبر رض | ۷٫۰۰ |
| عمر ، فاروق اعظم رض | ۱۲٫۰۰ |
| دس بڑے مسلمان | ۵٫۰۰ |
| خالد ، سیف اللہ رض | ۲٫۷۵ |
| الہارون | ۲٫۲۵ |
| ابوذر غفاری رض | ۲٫۰۰ |
| سلطان محمد فاتح رض | ۱٫۰۰ |
| الحسین رض | ۲٫۰۰ |
| رابعہ بصری رح | ۱٫۰۰ |
| امیر معاویہ رض | ۱٫۵۰ |
| عمر ابن عبدالعزیز رح | ۱٫۵۰ |
| امام زین العابدین رض | ۱٫۲۵ |
| شیخ عبدالقادر جیلانی رح | ۱٫۰۰ |
| ایک مفسر قرآن | ۱٫۷۵ |
| الزہرا رض | ۱٫۲۵ |
| تذکرہ | ۴٫۰۰ |
| قلوپطرہ | ۴٫۰۰ |
| روپ متی | ۳٫۰۰ |
| سلطانی محلوں کے راز | ۴٫۵۰ |
| 39 بڑے آدمی | ۴٫۰۰ |

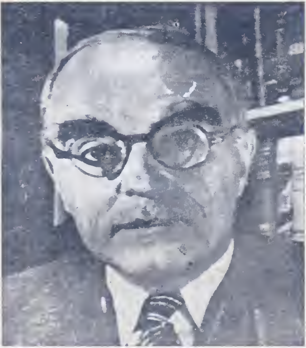

تھارنٹن وائلڈر